ماہنامہ

اِنذار

فروری 2018ء

مدیر
ابویحییٰ

قرآن پڑھتے رہیے
یہ اللہ سے ملاقات کا دوسرا نام ہے

www.inzaar.org

ماہنامہ

اِنذار

فروری 2018ء جمادی الاول/ جمادی الثانی 1439ھ

جلد 6 شمارہ 2

ابویحییٰ کے قلم سے

مدیر:
ابویحییٰ ریحان احمد یوسفی

سرکولیشن مینیجر:
غازی عالمگیر

معاون مدیر:
عابد علی، بنت فاطمہ،
سحر شاہ

معاونین:
محمد شفیق، محمود مرزا

فی شمارہ ــــ 25 روپے
سالانہ: کراچی (بذریعہ کوریئر) 500 روپے
بیرون کراچی (نارمل پوسٹ) 400 روپے
(زرتعاون بذریعہ منی آرڈر یا ڈرافٹ)
بیرون ملک 2500 روپے
(زرتعاون بذریعہ پوسٹل بیئرر آرڈر یا ڈرافٹ)
نارتھ امریکہ: فی شمارہ 2 ڈالر
سالانہ 24 ڈالر

P.O Box-7285, Karachi.
فون: 0332-3051201, 0345-8206011
ای میل: globalinzaar@gmail.com
web: www.inzaar.org

چار آنکھیں

سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے منسوب بہت سے حکیمانہ اقوال بیان کیے جاتے ہیں۔ان میں سے ایک یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی دوسرے کے خلاف یہ شکایت لے کر آئے کہ اس نے میری دونوں آنکھیں پھوڑ دی ہیں تب بھی کسی نتیجے پر پہنچنے سے پہلے دوسرے شخص کی بات سن لو۔ ہوسکتا ہے کہ اِس شخص نے اُس دوسرے شخص کی چار آنکھیں پھوڑی ہوں۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک انتہائی حکیمانہ نصیحت ہے۔ زندگی میں اکثر لوگ دوسرے لوگوں کی برائی بیان کرتے ہیں اور خود کو مظلوم ثابت کرتے ہیں۔ مگر یہ یکطرفہ موقف ہوتا ہے۔ انسانوں کی یہ عادت ہوتی ہے کہ وہ ہمیشہ خود کو درست اور دوسرے کو بالکل غلط ثابت کرتے ہیں۔ ایسے میں جو شخص یکطرفہ موقف ہی سن کر کوئی رائے قائم کرے گا، غالب امکان یہ ہے کہ وہ غلط نتیجے تک پہنچے گا۔

کسی خاندانی جھگڑے کو نمٹانا ہو یا مذہب و سیاست کے میدان میں کسی فریق کی بات کی سچائی کو جانچنے کا معاملہ ہو، یکطرفہ موقف کے بجائے دوسرے فریق کی بات سن کر رائے قائم کرنا ہی انسان کو درست نتیجے تک پہنچاتا ہے۔

اکثر لوگ اس بات کو درست ماننے کے باوجود اپنے جذبات و تعصّبات کی بنا پر یکطرفہ طور پر ایک ہی نقطہ نظر سننا پسند کرتے ہیں۔ جس شخص کے وہ مخالف ہوں اس کے خلاف کہی گئی ہر بات وہ بلا تحقیق مان لیتے ہیں۔ اسی طرح اپنے قریبی تعلق کے لوگ ہوں یا اپنے گروہ کا آدمی ہو، انسان یکطرفہ طور پر اس کی بات سن کر ہی رائے قائم کر لیتا ہے۔

اس کے بعد لوگ ہر الزام و بہتان، ظلم و زیادتی، جبر و ناانصافی کا حصہ بن جاتے ہیں۔ مگر انھیں یہ احساس تک نہیں ہوتا کہ وہ کتنے بڑے گناہ کا ارتکاب کر رہے ہیں۔ اس کے برعکس اہل ایمان ہمیشہ تحقیق کر کے رائے قائم کرتے ہیں۔ ورنہ خاموش رہ کر کسی اقدام سے پرہیز کرتے ہیں۔

Beggars can't be choosers

انگریزی زبان کی ایک کہاوت کا مفہوم ہے کہ بھکاری کو حق انتخاب نہیں ہوتا۔

Beggars can't be choosers

یہ موجودہ دنیا کی ایک بہت بڑی سچائی کا بیان ہے۔ یہاں خریدار کے پاس ہمیشہ انتخاب ہوتا ہے کہ وہ قیمت دے کر اپنی پسند اور مرضی کی چیز لے۔ لیکن جب کوئی شخص بھیک مانگتا ہے تو پھر اس کے پاس یہ انتخاب نہیں رہتا کہ وہ ایک چیز کو چھوڑ کر دوسری لے۔ وہ کمتر کو چھوڑ کر بہتر لے۔ وہ گھٹیا کو چھوڑ کر اعلیٰ شے کو حاصل کرے۔

یہ انسانوں کی دنیا کا معاملہ ہے۔ مگر اس کے برعکس خدا کی دنیا میں جہاں ہر شخص بھکاری ہے اور کوئی شخص خدا کے سامنے ایک فقیر سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا، ہر انسان وہ پاتا ہے جو وہ چاہتا ہے۔ انسان زندگی چاہتے ہیں، خدا ان کو زندگی دیتا ہے۔ ان کی شکل میں اور ان کی اولاد کی شکل میں بھی۔ انسان ہاتھ پاؤں اور اعضا کی سلامتی چاہتے ہیں۔ کم و بیش ہر انسان خدا سے کامل اعضا لے کر اس دنیا میں آتا ہے۔

انسان غذا، پانی اور ہوا کے محتاج ہیں؛ انھیں یہ ملتی ہیں۔ انسان رشتے ناطے، محبت اور خاندانی تعلقات چاہتے ہیں؛ یہ ان کو دیے جاتے ہیں۔ انسان گھر بار، دھرتی، سورج، موسم اور فطرت کی ان گنت نعمتوں کا حاجت مند ہے اور پروردگار یہ سب ان کو دیتا ہے۔ ان سب کے ساتھ دعا کی شکل میں انسان کو یہ موقع دیا گیا ہے کہ وہ جو چاہیں مانگ لیں۔ اس کے بعد بیشتر لوگ واقعی وہ سب کچھ پا لیتے ہیں جو وہ خدا سے مانگتے ہیں۔

مگر عجیب بات ہے کہ یہ فقیر اپنی مرضی کا پاکر ہمیشہ دینے والے کی مہربانی کو بھول جاتے ہیں۔ ہاں دو چار چیزیں جو امتحان کی غرض سے نہیں ملتیں، ہمیشہ ان کو یاد رکھتے ہیں۔ کتنا عجیب ناشکرا ہے یہ بھکاری اور کتنا کریم ہے وہ دینے والا۔

جنت، جہنم اور دنیا

موجودہ دنیا آخرت کی دنیا کا پہلا مرحلہ ہے جس میں اہل جنت اور اہل جہنم کا انتخاب ہورہا ہے۔ جنت خدا کو زندگی کا مرکزی خیال ، اس کی بندگی کو زندگی بنانے اور اس کے بندوں کے ساتھ عدل واحسان کی زندگی کا بدلہ ہے۔ جبکہ جہنم سرکشی، تکبر، ظلم اور معصیت کا نتیجہ ہے۔

موجودہ دنیا ایک دوسرے پہلو سے بھی جنت اور جہنم کا پہلا مرحلہ ہے۔ وہ یہ کہ اس دنیا میں جنت اور جہنم کا ایک ابتدائی مگر بھرپور تعارف پایا جاتا ہے۔ یہاں کانٹے جہنم کا تعارف کراتے ہیں اور پھول جنت کا۔ یہاں خوشبو جنت کا استعارہ ہے اور بدبو جہنم کا۔ اسی طرح اس دنیا میں کوئل کی کوک، شفق کی لالی، سرسبز وشاداب باغات، بہتے دریا، اڑتے پرندے اور ان جیسی ان گنت اشیا اپنی ذات میں جنت کا ابتدائی تعارف ہیں۔ اس کے برعکس تپتے صحراؤں کا سورج، آتش فشاں کی بھڑکتی آگ، زہریلے سانپوں کی پھنکار، بول وبراز کی غلاظت، محرومی، مایوسی اور پچھتاوے وغیرہ جہنم کا ابتدائی تعارف ہیں۔

انسانوں کا المیہ یہ ہے کہ انسان نہ اس دنیا کے دارالامتحان ہونے سے واقف ہیں نہ اس حقیقت کو سمجھتے ہیں کہ موجودہ دنیا اگلی دنیا کا ابتدائی تعارف ہے۔ وہ اسی دنیا میں اپنی جنت کی تلاش شروع کردیتے ہیں۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ دنیا اس اصول پر بنی ہی نہیں کہ یہاں کوئی شخص اپنی جنت بنا سکے۔ یہاں کوئی کتنی ہی کوشش کرلے، اس کی جنت میں غم و پریشانی کا سانپ ہر حال میں داخل ہوکر اس کا مزہ کرکرا کردیتا ہے۔

اس دنیا میں کامیاب شخص وہ نہیں جو مال ودولت جمع کر کے اپنی جنت بناتا ہے۔ یہاں کی ہر جنت میں کوئی نہ کوئی سانپ ضرور ہوتا ہے اور نہ بھی ہو تب بھی موت کی آندھی اس جنت کو ایک روز اجاڑ دے گی۔ اصل کامیاب وہ شخص ہے جو یہاں رہ کر بندگی اور خدمت کی زندگی گزارتا ہے۔ کیونکہ یہی رویہ انسان کو خدا کی ابدی جنت کا حقدار ثابت کرتا ہے۔

فحش تصاویر اور ہمارا مذہبی فکر

مذہب اور مذہبی فکر دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ مذہب اللہ اور اس کے رسول کی مرضی کا نام ہے۔ یہ قرآن وسنت کی شکل میں دنیا میں موجود ہے۔اس کے برعکس مذہبی فکر انسانوں کے فہم کا نام ہے۔ یہ انسانوں کے پس منظر، حالات، زمانے، ماحول اور ان جیسی متعدد چیزوں سے متاثر ہوتا ہے۔ یہی مذہبی فکر ہے جو مختلف مکاتب فکر، مسالک، فرقوں اور افکار کی شکل میں سامنے آتا ہے۔ یہ چونکہ انسانی کام ہے، اس لیے اس میں اختلاف ہوتا ہے، تضاد بھی سامنے آتا ہے، کمی بیشی ہوتی رہتی ہے اور باطل کے در آنے کا امکان بھی رہتا ہے۔

اس کے برعکس اللہ تعالیٰ نے ختم نبوت کے بعد چونکہ قرآن مجید کی حفاظت کا ذمہ خود لے رکھا ہے، اس لیے مذہبِ اسلام کی اصل تعلیم قیامت تک کے لیے محفوظ کر دی گئی ہے۔قرآن مجید نہ صرف اللہ اور اس کے رسول کے اصل پیغام کو بالکل واضح طور پر بیان کرتا ہے بلکہ دین کے مطالبات میں اصل اور فرع، بنیادی اور ثانوی، اصولی احکام اور سد ذریعہ کے احکام جیسی چیزوں کا فرق بھی واضح کر دیتا ہے۔

ہمیں یہ تفصیل کرنے کی ضرورت ایک خاص وجہ سے پیش آئی ہے۔پچھلے کچھ عرصے سے بائیں بازو کی نمائندہ سمجھی جانے والی ایک مشہور ویب سائٹ خواتین کی نازیبا تصاویر شائع کرنے کی وجہ سے دینی حلقوں اور سنجیدہ لوگوں کی طرف سے بجا طور پر اعتراضات کی زد میں ہے۔ زنا اللہ تعالیٰ کی نظر میں ایک بڑا جرم ہے ۔اس لیے اللہ تعالیٰ نے بدکاری ہی سے نہیں روکا بلکہ ان عوامل سے بھی روکا ہے جو زنا کے قریب لے جائیں۔

لیکن یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ اصل جرم بدکاری ہے۔ زنا سے قریب لے جانے والی چیزوں سے رکنے کا حکم سد ذریعہ کی نوعیت کا ہے۔اس کو ایک تقابلی مثال سے یوں سمجھیں کہ کسی

پر الزام و بہتان لگانا اللہ کے نزدیک بہت بڑا گناہ ہے۔ چنانچہ اس بڑے گناہ سے بچانے کے لیے سدذریعہ کے طور پر قرآن مجید نے لوگوں کو بہت زیادہ گمان کرنے سے بھی روکا ہے کہ یہی وہ چیز ہے جو آگے بڑھ کر الزام و بہتان کا سبب بنتی ہے۔ اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر سنی سنائی بات کو بلاتصدیق آگے بڑھانے سے منع کیا ہے۔ یہ سارے احکام سدذریعہ کی نوعیت کے ہیں جن کا مقصد یہ ہے کہ لوگ دوسروں پر جھوٹے الزام و بہتان لگا کر معاشرے میں ان کی عزت کو داغدار نہ کریں۔

اب اس تناظر میں ذرا دیکھیے کہ کچھ نیم عریاں، نامناسب اور فحش تصاویر کی اشاعت پر ہمارا مذہبی فکر سراپا احتجاج بنا ہوا ہے۔ بلاشبہ ایسی تصاویر کی اشاعت غلط ہے، مگر یہ اصل حکم یعنی زنا کے مقابلے میں بہت چھوٹی چیز ہے۔ اس کے برعکس دین کے کسی عالم کے خلاف جھوٹ، الزام و بہتان کی مہم چلانا ہمارے مذہبی فکر میں ایک معمولی بات ہے۔ حالانکہ قرآن مجید کی روشنی میں ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ لوگ سدذریعہ کے حکم کی تعمیل کرتے اور برا گمان کرنے سے بھی پرہیز کرتے۔ مگر یہاں حال یہ ہے کہ سدذریعہ کو تو چھوڑیے، اصل حکم کی کھل کر خلاف ورزی ہوتی ہے۔ اہل مذہب کے ہر پبلک فورم پر اطمینان سے وہ مواد شائع کیا جاتا ہے جو جھوٹ، الزام، بہتان سے عبارت ہوتا ہے، مگر کسی کی پیشانی پر پسینہ نہیں آتا۔ کسی کو خدا کا خوف نہیں آتا کہ روزِ قیامت اللہ تعالیٰ نے اس بہتان تراشی کے لکھنے، شائع کرنے، تائید کرنے اور پھیلانے والوں سے پوچھ گچھ شروع کر دی اور جو کہ ہونی ہی ہے تو وہ کیا جواب دیں گے۔

مگر مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے مذہبی لوگوں کی تربیت قرآن مجید کی روشنی میں نہیں ہوئی بلکہ مروجہ مذہبی فکر نے ان کی تربیت کی ہے۔ اس فکر میں کسی پر بہتان لگانا، اس کی طرف جھوٹی بات منسوب کرنا، اسے بدنام کرنے کی مہم چلانا، اس کے خلاف نفرت انگیز پروپیگنڈا کرنا، کسی سے بدگمانی کرنا، سنی سنائی بات کو بلاتصدیق آگے پھیلانا کوئی بری بات نہیں سمجھی جاتی۔

اسی طرح ہمارے مذہبی فکر میں اپنے احتساب سے زیادہ دوسروں کا احتساب کرنے پر زور دیا جاتا ہے۔ چنانچہ بیشتر لوگ جو مروجہ مذہبی فکر سے متاثر ہوتے ہیں، فوراً خدائی فوجدار بن کر دوسروں کے احتساب کے لیے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ یہ نفسیات انسان کو خدا کے خوف سے خالی کردیتی ہے۔ ایسے لوگ بدترین جرائم کا ارتکاب کرکے بھی سمجھتے ہیں کہ فرشتے جنت کا ٹکٹ ہاتھ میں لے کر ان کے انتظار میں کھڑے ہیں۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ خدا سے بے خوفی کا آخری نتیجہ جہنم کی آگ ہے۔

اس طرح کے لوگ اپنی اس روش کو جو خدا کے غضب کو بھڑکانے والی ہے، علمی تنقید کے نام پر سندِ جواز عطا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حالانکہ علم کا معمولی شعور رکھنے والا شخص بھی یہ بات جانتا ہے کہ علمی تنقید میں کبھی کسی متعین شخص کو نشانہ بنا کر اس کو بدنام کرنے کی مہم نہیں چلائی جاتی۔ کسی فرد کی نیت کے بارے میں فیصلہ نہیں سنایا جاتا۔ کسی کے موقف کو غلط بیان نہیں کیا جاتا۔ کسی کی بات غلط نقل نہیں کی جاتی۔ کسی کے منہ میں اپنی بات نہیں ڈالی جاتی۔ الزام، بہتان اور جھوٹ سے کام نہیں لیا جاتا۔ مسلمہ علمی معیارات کی خلاف ورزی نہیں کی جاتی۔

آج مذہب کے نام پر الزام و بہتان اور نفرت انگیز مہموں کا دور دورہ ہے۔ مگر جو لوگ اس طرح کی غلاظت کو مذہب کے نام پر پھیلاتے ہیں وہ درحقیقت خود کو دھوکا دے رہے ہیں۔ اس دنیا میں قرآن مجید یہ اعلان کررہا ہے اور کل بروزِ قیامت خدا کے فرشتے یہ اعلان کردیں گے کہ ایسی ہر روش مردود ہے۔ ایسی روش اختیار کرنے والوں کو اپنے کیے کا انجام بھگتنا ہوگا۔ جس روز فحش تصاویر شائع کرکے لوگوں کے جذبات بھڑکانے والے خدا کی گرفت میں آئیں گے، اُس روز ان لوگوں سے کہیں بڑھ کر وہ لوگ خدا کی گرفت میں آئیں گے جو مذہب کو استعمال کرکے لوگوں کے جذبات بھڑکاتے رہے تھے۔ کاش خدا کے نام پر کھڑے لوگ یہ جان لیں کہ خدا کی پکڑ کس چیز کا نام ہے۔

سرسری تم جہان سے گزرے

میر تقی میر (1723-1810) اردو زبان کے ممتاز ترین شعراء میں سے ہیں۔ میر ان لوگوں میں سے ہیں جنھوں نے ایک بولی کو اردو زبان بنا دیا تھا۔ ان کا ایک شعر اس طرح ہے۔

سرسری تم جہان سے گزرے

ورنہ ہر جا جہانِ دیگر تھا

یہ شعر سادہ ترین زبان میں ایک بہت بڑی حقیقت کا بیان ہے۔ وہ یہ کہ انسان اس دنیا میں بہت سطحی اندازِ فکر کے ساتھ جیتا ہے۔ وہ اپنی ذات، ضروریات اور مسائل و معاملات سے اٹھ کر زندگی، دنیا، حیات اور کائنات کی کسی حقیقت پر غور نہیں کرتا۔ وہ ٹھہر کر غور کرنے لگے تو ہر جگہ اور ہر مرحلے پر اسے معلوم ہوگا کہ ایک نئی دنیا پائی جاتی ہے۔

یہ بات جتنی زیادہ اٹھارہویں صدی کے انسان پر پوری اترتی تھی، اس سے کہیں زیادہ دورِ حاضر کے انسان پر پوری اترتی ہے۔ یوں تو ہر دور کا انسان ہی اپنی ذات، ضروریات اور مسائل و معاملات کا اسیر رہا ہے اور ان سے اوپر اٹھ کر حیات و کائنات کی حقیقتوں سے ہمیشہ بے پروا رہا ہے، لیکن آج کے انسان نے تو سطحی اور پست دلچسپیوں کی ایک نئی دنیا ایجاد کر لی ہے۔

یہ دلچسپیاں کیا ہیں، ذرا اس کا جائزہ لیتے ہیں۔ آج کے انسان کی شاید سب سے بڑی دلچسپی اپنے گھر کو چیزوں سے بھرنا ہے۔ لوگ ہمہ وقت مشینیں، آلات اور چیزیں خریدنے کی جستجو میں لگے رہتے ہیں۔ مگر اس کی قیمت بہت بھاری ہوتی ہے۔ انسان ختم نہ ہونے والی دوڑ (Rat Race) میں لگ جاتا ہے۔ اس ریس میں انسان اپنی اخلاقیات، روحانیت اور بار ہا انسانیت تک کا سودا کر لیتا ہے۔

دورِ جدید کے انسان کی ایک بہت بڑی دلچسپی ٹی وی اور سینما کی دنیا ہے۔ اس دنیا میں دو ہی

چیزیں زیادہ بکتی ہیں۔ایک عریانی اوردوسری تشدد۔یہی وہ مصالحہ ہے جو بیشتر فلموں اورڈراموں میں کم یا زیادہ ڈال کر ہر دفعہ پیش کر دیا جاتا ہے اورلوگ اسے دیکھتے چلے جاتے ہیں۔یہی چیز آگے بڑھتی ہے اور بہت سے لوگ پورنوگرافی جیسے مرض کے جزوی یا کلی مریض بن کر زندگی گزارتے ہیں۔اوران سب کے نتیجے میں اپنے قیمتی وقت اوراس سے زیادہ قیمتی اقدار کا زیاں کرتے رہتے ہیں۔جدید انسان کی ایک اوراہم اور غیر ضروری مصروفیت انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا کے ذریعے سے دنیا بھر کے حال اورلوگوں کے احوال سے باخبر رہنا ہے۔گرچہ اس کے بعد انھیں اپنے اردگرد کی خبر بھی اکثر نہیں رہتی۔

ان سطحی اور سرسری چیزوں میں لگ کر انسان کبھی نہیں سوچتا کہ وہ کیسی عجیب وغریب دنیا میں جیتا ہے۔اس دنیا میں کلیاں چٹکتی ہیں، پھول مہکتے ہیں، جگنو چمکتے ہیں،ستارے جگمگاتے ہیں، پرندے چہکتے ہیں،کوئل کوکتی ہے،فصلیں لہلہاتی ہیں، ہوائیں سرسراتی ہیں،موجیں امنڈتی ہیں، بارش برستی ہے،چاندنی زمین پراورشفق آسمان پر بکھرتی ہے۔

اس دنیا میں خدا کی صناعی ہے،اس کے جمال کا ظہور ہے،اس کے کمال کا عکس ہے، اس کی قدرت کے نظارے ہیں،اس کی رحمت کے اشارے ہیں،اس کی ربوبیت کے آثار ہیں، اس کے وجود کی نشانیاں ہیں،اس کی حکمت کے مظاہر ہیں اورسب سے بڑھ کر آنے والی اس زندگی کے دلائل بکھرے ہوئے ہیں جو یہ بتاتے ہیں کہ اس دنیا میں انسان کو امتحان کے لیے بھیجا گیا ہے۔اس لیے بھیجا گیا ہے کہ وہ آنے والی دنیا کے لیے عمل صالح کی پونجی جمع کرے۔

مگر آہ! انسان اس دنیا سے سرسری گزر جاتا ہے۔پیدائش سے موت تک وہ سطحی چیزوں میں مشغول رہتا ہے اور خدا اور آخرت جیسی سچی مگر پوشیدہ حقیقتوں کو دریافت نہیں کر پاتا۔یہی انسان کا اصل المیہ ہے۔

............کا بھیانک کھیل بے نقاب

پیشِ نظر مضمون کا نام ایک وڈیو سے لیا گیا ہے جو آج کل فیس بک اور انٹرنیٹ پر بہت مشہور ہے۔ اسے انٹرنیٹ کی سب سے زیادہ دیکھی جانے والی وڈیو کہہ کر شیئر کیا جارہا ہے۔ اس طالب علم کو جو وڈیو ملی اس کے ویوز کی تعداد لاکھوں میں تھی۔ جبکہ یہ وڈیو متعدد فیس بک پیجز، یوٹیوب اور دیگر ذرائع پر بھی الگ الگ دیکھی جارہی ہے۔ ان سب کے ویوز کو ملا لیا جائے تو عین ممکن ہے کہ واقعی یہ دعویٰ درست ثابت ہو جائے۔

اس وڈیو کا نام ''تبلیغی جماعت کا بھیانک کھیل بے نقاب'' ہے۔ وڈیو میں موجود مواد اس بات کے لیے کافی ہے کہ ایک شخص جو دیوبندی پس منظر کا نہیں ہے، اس کے دل و دماغ میں مولانا طارق جمیل، تبلیغی جماعت اور دیوبندی مکتب فکر کی شدید نفرت پیدا کر دے۔ تاہم اس طالب علم کے لیے اس طرح کی چیزیں ایک پرانی کہانی کی نئی قسط کے سوا کچھ نہیں۔ یہ عاجز ابتدائی عمر ہی سے یہ فرقہ وارانہ جنگ دیکھتا آرہا ہے جس میں ہر دینی، اخلاقی اور علمی حد عبور کر کے مخالف فریق کو بدنام کرنے کے لیے ہر ممکن حربہ اختیار کیا جاتا ہے۔ اس جنگ میں ہر فرقہ دوسرے فرقے اور ہر گروہ دوسرے گروہ کو جب تک کفر و ضلالت کے آخری مرحلے تک نہیں پہنچا دیتا، اسے چین نہیں ملتا۔ یہ کام بڑے ''اخلاص'' کے ساتھ کرتے تو کچھ ''اہل علم'' ہی ہیں، مگر ہر فرقے اور گروہ کے باقی لوگ حسب توفیق اس نفرت کو پھیلانے میں اپنا حصہ ڈال رہے ہوتے ہیں۔

جن لوگوں کو اس پوری صورتحال کے اسباب اور وجوہات کا پس منظر سمجھنا ہے وہ اس طالب علم کی کتاب ''تیسری روشنی'' کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔ تاہم اس مضمون میں ہمیں صرف دو چیزوں کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے۔ پہلی یہ کہ برصغیر میں نفرت کا یہ کھیل پہلی دفعہ دیوبندی مکتب فکر کے اکابر کے خلاف ہی کھیلا گیا تھا جب مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا

محمد قاسم نانوتوی، مولانا خلیل احمد سہارن پوری کو نبوت کا دعویٰ کرنے والے مرزا غلام احمد قادیانی کے ساتھ ایک ہی صف میں کھڑا کر کے ان کے خلاف کفر کا فتویٰ دیا گیا۔ اس فتوے کی توثیق حجاز مقدس کے علماء سے بھی کرائی گئی تھی۔ مگر عملاً اس کا نتیجہ بالکل الٹا نکلا۔ نفرت پھیلانے کی ایک انتہائی شدید اور مسلسل مہم کے باوجود ایک مدرسہ آج برصغیر کے ہزاروں مدارس، لاکھوں علما اور کروڑوں پیروکاروں میں تبدیل ہو چکا ہے۔

یہ صرف دیوبندی مکتب فکر کا معاملہ ہی نہیں ہے، یہی اہل حدیث مکتب فکر کے ساتھ ہوا۔ وہ بھی ایسی ہی نفرت انگیز مہموں کا نشانہ بنے۔ مگر آج اہل حدیث مکتب فکر بھی خوب پھل پھول رہا ہے اور اب بعض معاصر تعلیمی کاموں کے نتیجے میں پہلی دفعہ ایک عوامی مکتب فکر بن چکا ہے۔ ایسی ہی نفرت انگیز مہم کا نشانہ مولانا مودودی جیسے جلیل القدر عالم اور مفکر کو بھی بنایا گیا۔ مگر آج حال یہ ہے کہ برصغیر تو دور کی بات ہے پوری مسلم دنیا انھی کی بولی بولتی ہے۔ جبکہ ان کی اپنی بہت موثر جماعت کے علاوہ ان کے متاثرین میں اہل علم و دانش اور عوام الناس کی ایک بڑی تعداد دنیا بھر میں موجود ہے۔

طوالت کے اندیشے سے بچنے کے لیے ہم نے برصغیر کی تاریخ پر اکتفا کیا ہے ورنہ امام ابو حنیفہ سے لے کر امام ابن تیمیہ اور بعد کی تاریخ کا بھی یہی سبق ہے۔ مگر تاریخ کی بدقسمتی یہ ہے ہے کہ وہ خود کو دہراتی رہتی ہے، مگر کوئی اس سے کچھ نہیں سیکھتا اور پرانی روش بار بار دہرائی جاتی ہے۔ اس لیے اطمینان رکھنا چاہیے کہ موجودہ دور میں بھی جو لوگ ''تبلیغی جماعت کا بھیانک کھیل بے نقاب'' جیسی چیزوں کو پھیلا کر پرانی روش پر قائم ہیں یا معاصر اہل علم کے خلاف یہی روش اختیار کر رہے ہیں، ان کی کوششوں کا انجام وہی ہونا ہے جو پچھلوں کی کوششوں کا ہوا ہے۔

دوسرا پہلو جو زیادہ اہم ہے وہ یہ ہے کہ آج سے پہلے ''تبلیغی جماعت کا بھیانک کھیل بے

نقاب'' جیسے تماشے کتابوں، جلسوں اور منبروں تک محدود تھے جنھیں اپنے فرقے کے لوگ ہی سنا کرتے تھے۔ وہ ان تماشوں میں بیان کردہ ''واضح دلائل'' کو ایمانیات سمجھ کر قبول کر لیتے تھے۔ مگر اب انٹرنیٹ، یوٹیوب، فیس بک وغیرہ پر یہ سارا تماشا عوام کے سامنے ہو رہا ہے۔ اب صورتحال یہ نہیں کہ ایک فرقہ دوسرے فرقے کے خلاف یہ یکطرفہ پروپیگنڈا سن رہا ہے اور باقی دنیا بے خبر ہے۔ بلکہ اب عام لوگ ہر فرقے کی دوسرے فرقے اور ہر گروہ کی دوسرے گروہ کو بدنام کرنے کی یہ ''مخلصانہ'' مہم بڑی دلچسپی سے دیکھ رہے ہیں۔

اب عام لوگ ''............ کا بھیانک کھیل بے نقاب'' جیسے عنوانات کی خالی جگہ میں کسی بھی جماعت، گروہ یا عالم کا نام ڈال کر انٹرنیٹ سے سرچ کر لیتے ہیں۔ پھر وہ یہ دیکھتے ہیں کہ ہر گروہ دوسرے گروہ کو اپنے دلائل سے کافر، گمراہ اور زندیق ثابت کرنے پر تلا ہوا ہے۔ یہ عام لوگ اس طرح کے تماشوں کو ایمانیات سمجھ کر نہیں قبول کر رہے۔ ان کے لیے تو یہ دین، ایمان اور مذہبی روایات کو بالکلیہ رد کرنے یا عملی طور پر اس سے دور ہو جانے کا ایک جواز بن رہا ہے۔ اس لیے اس بات کا امکان دن بدن بڑھ رہا ہے کہ ہماری اگلی نسل مذہب سے دور ہوتی چلی جائے گی۔

حقیقت یہ ہے کہ دہشت گردی کے ساتھ ساتھ اس طرح کی نفرت انگیز مہمیں ہمارے ملک میں سیکولر حلقوں کی تقویت کا سب سے بڑا سبب بن رہی ہیں۔ ملک کے تمام باشعور لوگ مذہب کے نام پر نفرت پھیلانے کے اس عمل سے بیزار ہو چکے ہیں۔ ایسے میں عوام کی ایک بڑی تعداد خود مذہب ہی کو زندگی سے نکال پھینکنے کو عافیت کا راستہ سمجھ کر اس پر گامزن ہو چکی ہے۔ اس کا الزام لاکھ کسی اور پر ڈالا جائے، مگر اس کی ایک بڑی وجہ یہی وہ نفرت انگیز مہمیں ہیں جو مذہب کے نام پر پھیلائی جا رہی ہیں۔ ایسے میں باشعور اور دین کا درد رکھنے والے لوگوں کی ذمہ داری ہے کہ ایسی نفرت انگیز مہموں کی حتی الامکان حوصلہ شکنی کریں۔

ابو یحییٰ

تنقید کے اصول

محترمی ومکرمی............ 12 ستمبر، 2017

السلام علیکم ورحمت اللہ وبرکاتہ

بڑی عنایت کہ آپ نے بندے کو اس قابل سمجھا کہ تنقید کرنے سے قبل مجھے اطلاع دی۔ تاہم اس کی ضرورت ہرگز نہیں تھی کیونکہ میں ہمیشہ تنقید کا خیر مقدم کرتا ہوں۔ اس لیے کہ معقول تنقید میری دنیا اور نامعقول تنقید میری آخرت کے فائدے کا سبب بنتی ہے۔ مگر بارہا دیکھا گیا ہے کہ بعض تنقیدیں، تنقیدیں نہیں ہوتی بلکہ ناقدین کے جذبات کا اظہار ہوتی ہیں۔ اس لیے قبل اس کے کہ آپ تنقید کریں، کچھ گزارشات پیش خدمت ہیں۔

تنقید کبھی اپنے تعصّبات کی بنیاد پر نہ کریں۔ خاص کر اس خاکسار پر۔ اس لیے کہ یہ خاکسار فکری طور پر کبھی وہیں کھڑا تھا جہاں اس وقت کے تمام متعصب، فرقہ پرست اور انتہا پسند مذہبی ذہن کے حاملین کھڑے ہیں۔ پھر اس گناہ گار پر اللہ کا فضل ہوا اور اس نے اپنے ہر تعصب کو قرآن مجید کی کسوٹی پر پرکھا اور جسے اس کسوٹی پر کھوٹا پایا، اٹھا کر پھینک دیا۔ اب اگر کوئی بھائی یا بہن اپنے تعصّبات کی دنیا ہی میں جیتا ہے تو میں اس کے لیے دعا تو کر سکتا ہوں، اس کی کسی بات کو سنجیدگی سے نہیں لے سکتا۔

تنقید کو کبھی آپ کے جذبات کا اظہار نہیں ہونا چاہیے بلکہ یہ معقولیت پر استوار ہونا چاہیے۔ اس کی بنیاد علم و استدلال پر ہونی چاہیے۔ یہ نہیں کہ آپ جذباتی طور پر کسی معاملے میں حساس

ہوں اور ان جذبات کو دلائل کے قالب میں پیش کرنے کی کوشش کریں۔ ایسی ہر کوشش معقولیت کی ایک مار بھی نہیں سہہ سکتی۔

تنقید سے پہلے وسعت علم اور وسعت مطالعہ ضروری ہے۔ بارہا دیکھا گیا ہے کہ لوگ اپنی دانست میں کسی کی غلطی کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک رہے ہوتے ہیں، مگر اصلاً یہ تنقید علم و عمل کی اس روایت کے خلاف ہوتی ہے جس کو اسلاف بھی بیان کرتے ہیں اور متقدمین کے افکار میں بھی وہ مل جاتی ہے۔ ایسے میں تنقید کرنے والے کو تنقید کے بجائے اپنی کم علمی کو دور کرنا چاہیے۔

تنقید کو الزام، بہتان، جھوٹ، کم فہمی اور کم سمجھی جیسے اخلاقی اور علمی عوارض سے پاک ہونا چاہیے۔ ہر اخلاقی عارضہ روز قیامت گرفت کا سبب بنے گا اور علمی عارضہ اسی دنیا میں رسوائی کا سبب بن سکتا ہے۔

تنقید کرنے والا جس طرح یہ سمجھ کر تنقید کرتا ہے کہ وہ سامنے والے کی غلطی کو واضح کر رہا ہے، اسے کبھی اس امکان کو رد نہیں کرنا چاہیے کہ وہ خود بھی غلط ہو سکتا ہے۔ یہ صرف پیغمبر ہوتے ہیں جو غلطی سے پاک ہوتے ہیں۔ ان کے بعد سب عام انسان ہیں۔ اس لیے کبھی خود کو پیغمبر سمجھ کر اور ہر غلطی سے مبرا جان کر تنقید کے لیے نہیں کھڑے ہونا چاہیے۔

یہ چند اصولی گزارشات آپ کی خدمت میں پیش ہیں۔ تنقید سننے کے لیے بندہ حاضر ہے۔ مگر اپنی تنقید لکھنے کے بعد اس تنقید کو ایک دو دفعہ اس عاجز کی ان معروضات پر ضرور پرکھ لیجیے گا۔

والسلام

بندہ عاجز

ابو یحییٰ

\---------------------

ابو یحییٰ

اللہ کا قانون مکڑی کا جالا نہیں

کسی بے گناہ انسان کو قتل کرنا ایک بہت بڑا جرم ہے۔ بدقسمتی سے دورِ جدید میں اس جرم کے حوالے سے قاتلوں کو سزائے موت نہ دینے کو ایک نوعیت کی عمومی قبولیت حاصل ہو چکی ہے۔ دنیا میں موجود دو سو کے قریب ممالک میں سے نصف سے زیادہ یعنی 103 ممالک سے سزائے موت قانونی طور پر ختم کی جا چکی ہے اور تیس ممالک عملی طور پر سزائے موت نہیں دیتے۔

اسلام جو عالم کے پروردگار کا نازل کردہ دین ہے اس میں سزائے موت اور قصاص کے قانون کو نہ صرف مسلمانوں پر فرض کیا گیا ہے بلکہ اس کی طرف یہ کہہ کر بھی توجہ دلائی گئی ہے کہ اس میں تمھارے لیے زندگی ہے، (البقرہ 2: 179-178)۔

چنانچہ اسلام کا موقف جدید دنیا کے اس موقف کے بالکل خلاف ہے جس میں قتل کے مجرموں کو سزائے موت نہیں دی جاتی۔ تاہم پاکستان میں سزائے موت کا جو قانون نافذ ہے، اس میں عرصے سے بعض ایسے سقم سامنے آرہے ہیں جن کی بنا پر اسلام میں سزائے موت کا قانون جسے معاشرے کی زندگی کہا گیا ہے، ایک دوسرے پہلو سے معاشرے میں منفی انداز سے زیر بحث آرہا ہے۔ آج کے ''سلسلہ روز وشب'' کے اس کالم میں ہم اس حوالے سے اسلام کا نقطہ نظر درست تناظر میں پیش کرنے کی کوشش کریں گے۔

موجودہ قانون

ہمارے ہاں اس وقت جو موجودہ قانون رائج ہے، اس میں ایک طرف قتل کے مجرم کو بطور قصاص سزائے موت دینے کی شق موجود ہے اور دوسری طرف اس میں دیت یا خون بہا (Blood Money) کے عوض قاتل کو چھوڑ دینے کی ایک رعایت موجود ہے۔ یہ رعایت

چونکہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے خود دی ہے، اس لیے اس میں سراسر خیر ہے اور اس کی وضاحت کر کے بتایا جاسکتا ہے کہ کس طرح یہ نفرتوں کو ختم کر کے معاشرے میں خیر اور بہتری پیدا کرتی ہے۔ مگر سرِ دست مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے موجودہ قانون میں اس بات کو لازمی کر دیا گیا ہے کہ اگر مقتول کے ورثا صلح پر راضی اور قاتل کو معاف کرنے پر تیار ہو جائیں تو قاتل کو لازماً معاف کر دیا جاتا ہے۔

اس کے نتیجے میں کافی عرصے سے یہ مسئلہ سامنے آ رہا تھا کہ ہمارے ملک میں جہاں غیرت کے نام پر قتل عام ہے، ایک شخص اپنی سگی بہن کو قتل کر دیتا اور پھر قاتل کے ماں باپ جو مقتول بہن کے والدین ہونے کی بنا پر ورثا بھی ہیں، وہ اپنے قاتل بیٹے کو بچانے کے لیے اسے معاف کر دیتے۔ جس کے بعد اس طرح کے الزامات کا شکار لڑکیوں کا قتل ایک کھیل بن کر رہ گیا ہے۔

ہمارے معاشرے میں چونکہ اس طرح کے الزامات کی شکار لڑکیوں کو پہلے ہی ہمدردی کی نظر سے نہیں دیکھا جاتا، اس لیے معاشرہ ایسے معاملات پر خاموش رہا۔ یہاں تک کہ سن 2011 میں ریمنڈ ڈیوس نامی امریکی ایجنٹ کو دیت کے عوض چھوڑ دینے کا واقعہ پیش آیا۔ اُس زمانے میں چونکہ عوامی جذبات امریکہ کے خلاف تھے اور معاملے کی نوعیت بھی ایسی تھی کہ اس نے دو پاکستانیوں کو لاہور میں سرِ بازار قتل کیا تھا، اس لیے میڈیا نے اس معاملے کو بہت نمایاں کیا۔

اس واقعہ کے بعد ہمارے ہاں پہلی دفعہ اس معاملے پر بحث ہوئی کہ اس طرح دیت کے عوض کسی کو چھوڑ دینا جو بظاہر عدل و انصاف کے تمام تقاضوں کی پامالی لگتا ہے، کیا واقعی اللہ تعالیٰ جیسی منصف اور حکیم ہستی کا کوئی حکم ہوسکتا ہے۔ کیونکہ اس واقعے میں ایک سپر پاور نے تمام تر اثر و رسوخ استعمال کر کے اپنے ایک قاتل ایجنٹ کو صرف دو ماہ کی قلیل مدت میں قانون کی زد سے صاف نکال لیا تھا۔

شاہ رخ جتوئی کیس

حال ہی میں یہ بحث ایک دفعہ پھر اس وقت پیدا ہوگئی ہے جب شاہ رخ جتوئی نامی ایک نوجوان کو دیت کے اسی قانون کے تحت رہائی مل گئی۔ شاہ رخ جتوئی نے سن 2012 میں ایک نوجوان شاہ زیب کو اپنی بہن کے تحفظ کے لیے کھڑا ہونے کے جرم پر قتل کر دیا تھا۔ شاہ رخ جتوئی ایک بہت بڑے طاقتور اور اثر ورسوخ والے خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ اس لیے ابتدا میں اس کو گرفتار نہیں کیا گیا۔ مگر پھر پہلے سوشل اور پھر الیکٹرونک میڈیا نے پوری قوت کے ساتھ آواز اٹھائی تو اس کی گرفتاری عمل میں آئی۔

اس کے خاندان نے ہر قدم پر اپنے تعلقات اور اثر ورسوخ کے ذریعے سے شاہ رخ جتوئی کو سزا سے بچانے کی کوشش کی۔ ہمارے ہاں قانون ویسے بھی مکڑی کے جالے کی حیثیت رکھتا ہے جو کمزوروں کو شکنجے میں جکڑ لیتا ہے اور طاقتور اسے ہنستے کھیلتے ہوئے توڑ کر نکل جاتا ہے۔ مگر اس دفعہ چونکہ پورا معاشرہ اس کیس کے پیچھے کھڑا تھا، اس لیے تمام تر کوششوں کے باوجود شاہ رخ جتوئی کو سزا سے نہیں بچایا جا سکا اور سن 2013 میں اسے سزائے موت سنا دی گئی۔

تاہم شاہ رخ جتوئی نے سزائے موت کے بعد تمام میڈیا کے سامنے ہنستے ہوئے وکٹری کا نشان بنا کر پورے معاشرے کو یہ پیغام دیا تھا کہ قانون اس کے سامنے مکڑی کا ایک جالا ثابت ہوگا۔ مختلف مراحل سے گزر کر آخر کار اُسی کی بات درست ثابت ہوئی جب دسمبر 2017 میں دیت کے قانون کے تحت عدالت میں یہ راضی نامہ پیش کیا گیا کہ شاہ زیب کے خاندان نے شاہ رخ جتوئی کو معاف کر دیا ہے۔

قتل اور معاشرہ

جیسا کہ ہم نے پیچھے عرض کیا کہ ہمارے قانون میں یہ بات موجود ہے کہ اگر کسی قاتل کو مقتول کے ورثا معاف کر دیں تو پھر اسے ہر حال میں چھوڑ دیا جائے گا۔ اس پر سوال یہ پیدا ہوتا

ہے کہ کیا واقعی اللہ تعالیٰ کی یہ منشا ہے کہ اگر ورثا معاف کر دیں تو قاتل کو چھوڑ دینا لازمی ہو جاتا ہے۔

ہمارے نزدیک یہی وہ مقام ہے جسے نہ سمجھنے کی بنا پر اللہ تعالیٰ کے قانون پر نہ صرف سوالات پیدا ہو رہے ہیں بلکہ طرح طرح سے اسے طنز و تعریض کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ مثلاً یہ کہ آپ کے پاس اگر بہت سارے پیسے ہیں تو آپ کسی کو بھی قتل کر سکتے ہیں۔ یا یہ کہ آپ کی طاقت آپ کو لوگوں کو قتل کرنے کا لائسنس دے دیتی ہے۔ ظاہر ہے اس طرح کی چیزوں سے نظریں نہیں چرائی جا سکتیں نہ لوگوں کے منہ بند کیے جا سکتے ہیں۔

ہمارے نزدیک اس معاملے میں اللہ تعالیٰ کی منشاء کے ایک حصے کو نہ سمجھنے کی بنا پر قانون میں ایک سقم پیدا ہو گیا ہے جسے دور ہونا چاہیے۔ عام طور پر قرآن مجید کے بعض بیانات کی بنا پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ مقتول کے ورثا ہی قتل کے کیس میں واحد فریق ہیں۔ چنانچہ وہ چاہیں تو قاتل کو قتل کرا دیں اور چاہیں تو معاف کر دیں۔ تاہم قرآن مجید اس حوالے سے ایک مختلف زاویہ نظر دیتا ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک قتل سماج کے خلاف اٹھایا گیا ایک قدم ہے۔ اس بات کو اللہ تعالیٰ نے اس طرح بیان کیا ہے۔

> ”جس نے کسی ایک انسان کو قتل کیا، اس کے بغیر کہ اس نے کسی کو قتل کیا ہو یا زمین میں کوئی فساد برپا کیا ہو تو اس نے گویا تمام انسانوں کو قتل کر دیا۔“ (المائدہ 32:5)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ بات واضح کر دی ہے کہ قتل کے کیس میں انسانیت یا سماج بھی ایک فریق ہوتا ہے جسے ہر قتل کے موقع پر قتل کیا جاتا ہے۔ چنانچہ اس بات کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ قاتل کو اس کے کیے کی سزا دینا اس کی اخلاقی ذمہ داری ہے۔ سورہ بقرہ آیت 178 میں اللہ تعالیٰ نے اس اخلاقی ذمہ داری کو یہ کہہ کر ایک قانونی اور لازمی ذمہ داری بنا دیا کہ تم پر مقتولوں کا قصاص لینا فرض کر دیا گیا ہے۔ تاہم اسی آیت میں یہ رعایت دی گئی ہے کہ مقتول کے ورثا خون

بہا قبول کر کے قاتل کو معاف کر سکتے ہیں۔ لیکن یہ بات اگر واضح ہے کہ ورثا قتل کے اس مقدمے میں تنہا نہیں بلکہ ایک فریق ہیں اور دوسرا فریق خود سماج ہے تو اس سے بات سمجھی جا سکتی ہے کہ معافی کے لیے دوسرے فریق کا آمادہ ہونا بھی ضروری ہے۔ سماج اگر یہ سمجھتا ہے کہ کسی ''ریمنڈ ڈیوس'' کو معاف کرنے کے نتیجے میں بڑی طاقتوں کو ہمارے ملک میں کسی بھی شخص کو قتل کرنے کا لائسنس مل جائے گا، یا کوئی ''شاہ رخ جتوئی'' اپنی طاقت اور دولت کے بل بوتے پر کسی کو بھی قتل کرنے کا حوصلہ پالے گا یا غیرت کے نام پر ملی بھگت سے کیئے گئے قتل میں پہلے بیٹا بہن کو قتل کرے گا اور پھر باپ اسے معاف کر کے بچا لے گا تو سماج اس طرح کی ہر صورت میں معافی کو رد کرنے کا حق رکھتا ہے۔

دو آیات کا غلط فہم

مقتول کے ولی یا وارث کو قاتل کی معافی کا کلی اختیار دینے کی وجہ دو آیات قرآنی کا غلط فہم ہے۔ مضمون کے آخر میں ان کی وضاحت بھی ضروری ہے۔ پہلی اور بنیادی آیت سورہ بنی اسرائیل کی آیت نمبر 33 ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ مظلومانہ قتل کیے جانے والے شخص کے ولی کو ہم نے اختیار دے دیا ہے۔

اس اختیار (سلطان) کے لفظ سے یہ بات سمجھی گئی ہے کہ مقتول کا ولی یا وارث قاتل کو قتل کرنے یا معاف کر کے آزاد کرنے کا مکمل اختیار رکھتا ہے۔ آیت اس بات کو قبول نہیں کرتی۔ پوری آیت کا مطالعہ یہ صاف صاف بتاتا ہے کہ اس اختیار کا تعلق بدلہ لینے سے ہے نہ کہ معافی سے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اس آیت میں معافی سرے سے زیر بحث نہیں بلکہ قتل کے بدلے میں قتل زیر بحث ہے۔ چنانچہ آیت سے جو بات دراصل نکلتی ہے وہ یہ ہے کہ ولی مقتول کے بدلے میں قاتل کو قتل کرانے کا مکمل اختیار رکھتا ہے۔ وہ اگر بدلہ لینا چاہتا ہے تو حکومت یا عدالت کسی صورت قاتل کو معاف نہیں کر سکتی بلکہ اسے ولی کی مدد کرنا ہوگی۔

دوسری آیت سورہ بقرہ کی آیت 178 ہے۔اس میں خون بہا کے بدلے میں قاتل کی معافی کی جو رعایت دی گئی ہے، اس سے یہ بات غلط طور پر سمجھ لی گئی کہ اس معافی کے بعد قاتل کو معاف کرنا لازمی ہو چکا ہے۔ یہ بھی ایک غلط فہمی ہے۔اس کو سورہ بقرہ کی ذرا آگے آنے والی روزے کی فرضیت کی آیات کے تقابل سے سمجھا جا سکتا ہے۔ان میں روزہ کی فرضیت کے بعد مریض و مسافر کو یہ رعایت دی گئی ہے کہ وہ رمضان کے مہینے میں روزہ چھوڑ کر بعد کے دنوں میں روزے پورے کر سکتے ہیں۔لیکن ظاہر ہے کہ یہ ایک رعایت ہے۔ مریض یا مسافر کے لیے روزے چھوڑنا فرض نہیں ہو جاتا بلکہ وہ روزے چھوڑ سکتے ہیں۔ٹھیک اسی طرح ولی سے ملنے والی معافی کی شکل میں حکومت بھی قاتل کو چھوڑ سکتی ہے، مگر یہ اس کے لیے لازمی نہیں ہو جاتا کہ وہ قاتل کو چھوڑ ہی دے۔اگر وہ سمجھتی ہے کہ اس معافی سے دیگر لوگوں کی حوصلہ افزائی ہوگی کہ وہ بھی اسی طرح کسی کو قتل کر کے اپنے تعلق، طاقت، دولت اور اثر و رسوخ کی بنا پر بچ جائیں گے تو وہ معافی کو رد کر کے موت کی سزا باقی رکھ سکتی ہے۔

ان دو آیات کا یہ فہم اگر واضح ہے تو پھر جان لینا چاہیے کہ اللہ کا قانون سر تا سر حکیمانہ ہے۔ یہ کوئی مکڑی کا جالا نہیں کہ طاقت ور اس کو توڑ کر نکل جائیں اور کمزور پھنس جائیں۔ اس میں جو رعایت ہے وہ اس لیے کہ قاتل اگر شرمندہ ہو، طاقت اور دولت کو استعمال کرنے کے بجائے رحم کی بھیک مانگ رہا ہو تو مقتول کے ورثا چاہیں تو خون بہا لے کر اسے معاف کر سکتے ہیں۔

لیکن اگر ہر شخص کو نظر آ رہا ہو کہ اثر و رسوخ استعمال ہو رہا ہے، ملی بھگت ہو رہی ہے، مقتول کے ورثا کو ڈرایا دھمکایا جا رہا ہو تو پھر عدالت ان کی معافی کے باوجود اپنا اختیار استعمال کر کے قاتل کو سزا دے گی۔ یہی اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہے کہ قصاص میں معاشرے کی زندگی ہے۔

جہاں رہیے، بندگان خدا کے لیے رحمت بن کر رہیں، باعث زحمت نہ بنیے۔

محمد عامر خاکوانی

زندگی صرف ریاضی کا عدد نہیں

کچھ عرصہ قبل ایک نئی ریسرچ رپورٹ نظر سے گزری۔ ریسرچ کے مطابق انسانی زندگی صرف عدد کا نام نہیں۔ مثلاً اگر تاریخ پیدائش کے لحاظ سے کچھ افراد کی عمر 30 سال ہے تو ضروری نہیں ہے کہ وہ سب حقیقتاً 30 سال ہی کے ہوں گے۔ ان میں سے کچھ لوگوں کی اصل عمر 30 سال سے کہیں کم اور کچھ کی 30 سال سے کہیں زیادہ ہوسکتی ہے۔

ہمارے روزمرہ کے مشاہدے میں ایسے بے شمار کیس آتے ہیں۔ دوست احباب، رشتے داروں، جاننے والوں یا بسا اوقات کسی معروف کھلاڑی، شوبز سیلیبریٹیز میں ایسے لوگ ملتے ہیں، لگتا ہے جیسے ان کی عمر ایک جگہ ٹھہر گئی ہو۔ وہ اپنی اصل عمر سے برسوں کم نظر آئیں گے۔ ہمارے اخبار کے میگزین میں کرکٹر رمیز راجہ پر مضمون شائع ہوا ہے، ان کی تصاویر دیکھ کر واقعی ایسے لگا جیسے گزرتی عمر نے رمیز کا کچھ نہیں بگاڑا۔ میاں بیوی کی ایک تصویر بھی شائع ہوئی، جس میں ان کی اہلیہ محترمہ اپنی فطری عمر کے مطابق اور شوہر نامدار ان سے خاصے چھوٹے لگ رہے تھے، حالانکہ دونوں ایک ہی کلاس میں پڑھتے تھے اور یقیناً ہم عمر ہی ہوں گے۔ ہمارے زمانے کے پی ٹی وی کے کئی فنکار آج بھی پہلے کی طرح تروتازہ نظر آتے ہیں۔ ماہ نور بلوچ جو آج سے بیس پچیس سال پہلے بھی پختہ ہیروئن تھیں، آج انہیں دیکھا جائے تو لگتا ہے جیسے پچیس کی جگہ ان میں صرف پانچ برسوں کا اضافہ ہوا ہو۔ اگلے روز اخبار میں بھارتی اداکار شیکھر سمن کی تصویر دیکھی، جس میں ان کے شاندار باڈی مسلز نظر آرہے تھے۔ شیکھر سمن نے اپنے بارے میں خود کہا کہ لگتا ہے میں دوبارہ جوان ہورہا ہوں۔

یہ سب کیسے ہوتا ہے؟ یقیناً کچھ فیکٹر موروثی خصوصیات کا بھی ہے۔ عام طور سے ہم کہہ دیتے

ہیں کہ فلاں شخص جتنا کھائے، وہ موٹا نہیں ہوتا، اس کی ہڈی ہی ایسی ہے۔ یہ موروثی خصوصیت ہے، میٹابولزم تیز ہونا اس کا سبب ہے، جس کے باعث اس کی چربی پگھل جاتی ہے، موٹاپا نہیں چڑھتا۔ اس کے لیے مگر کچھ قیمت بھی ادا کرنا پڑتی ہے۔ زندگی میں ڈسپلن رکھنے والے لوگ اپنے ہم عصروں سے مختلف ہوتے ہیں۔ کم خوراک کھانے اور پیدل چلنے کی عادت رکھنے والے بہت سی ایسی بیماریوں سے بچے رہتے ہیں، جن کا میرے جیسے خوش خوراک نشانہ بن جاتے ہیں۔ مزے دار نہاریوں، ہریسے، پائے، بھنے گوشت، دنبہ کڑھائیوں، انواع واقسام کے کباب، تلوں والے کلچے اور رس ملائی، حلوہ جات کھانے کی کچھ قیمت تو ادا کرنا پڑتی ہے۔ یہ تو قدرت کا انصاف ہی ہے۔

خیر بات ریسرچ کی ہورہی تھی، رپورٹ کے مطابق، ہماری روزمرہ گفتگو میں اور شناختی دستاویزات میں عمر کا لفظ کثرت سے استعمال ہوتا ہے۔ لیکن، سائنس دانوں کا کہنا ہے کہ عمر محض ایک ہندسہ ہے اور اس عمر کی حقیقت، جس کا تعلق ہماری تاریخ پیدائش سے ہے، فریب نظر کے سوا کچھ نہیں۔ سائنس دان کہتے ہیں انسان کی اصل عمر اس کی بائیولاجیکل ایج یعنی حیاتیاتی عمر ہوتی ہے۔ یعنی اس کے جسمانی خدوخال اور اعضائے رئیسہ کس رفتار سے وقت کا سفر طے کر رہے ہیں اور یہ سفر ان کے اندر کیا تبدیلیاں لا رہا ہے۔ آپ نے بھی محسوس کیا ہوگا کہ کچھ لوگ اپنی تاریخ پیدائش کے لحاظ سے زیادہ بڑے دکھائی دیتے ہیں اور کچھ پر یہ گمان ہوتا ہے کہ جیسے ان کی عمر کسی ایک مقام پر آ کر ٹھہر گئی ہے۔ یہی اس شخص کی حیاتیاتی عمر ہوتی ہے۔

یہ تفصیلی ریسرچ نیشنل اکیڈمی آف سائنس، واشنگٹن کے جریدے میں شائع ہوئی اور اس میں کنگز کالج، لندن اور امریکہ کی ڈیوک یونیورسٹی کے پروفیسرز نے حصہ لیا۔ سائنسی مطالعے میں 954 رضا کاروں کو موضوع بنایا گیا۔ ان تمام افراد کا تعلق نیوزی لینڈ کے شہر ڈنیڈن (Dunedin) سے تھا اور وہ سب 1972ء اور 1973ء کے دوران پیدا ہوئے تھے۔ کیلنڈر

کے لحاظ سے اس وقت ان کی عمریں 38 سال ہیں، لیکن جب انہیں بائیولاجیکل ایج کے پیمانے پر پرکھا گیا تو ان کی عمریں 28 سال سے لے کر 61 سال تک نکلیں۔ تقریباً 35 سال تک جاری رہنے والی اس تحقیق میں یہ جاننے کے لیے کہ رضا کاروں کی بائیولاجیکل ایج کس رفتار سے بڑھ رہی ہے۔ یا دوسرے لفظوں میں وہ کس تیزی سے بڑھاپے کی جانب بڑھ رہے ہیں، چھبیس، بتیس اور اڑتیس سال کی عمر میں ان پر تجربات کیے گئے۔ سائنسدانوں کو پتہ چلا کہ بعض افراد کی حیاتیاتی عمر ایک کیلنڈر سال میں تین سال تک بڑھی، کچھ رضا کاروں کی عمر بڑھنے کی رفتار ایک کیلنڈر سال میں بارہ مہینوں سے کم تھی جبکہ اکثریت کی عمر میں ایک کیلنڈر سال کے دوران بارہ مہینے کا اضافہ ہوا۔ جن رضا کاروں کی عمر بڑھنے کی رفتار تیز تھی، وہ اپنے دوسرے ساتھیوں کے مقابلے میں عمر رسیدہ دکھائی دیے، جب کہ جن کی عمر میں اضافے کی رفتار سست تھی، وہ اپنی عمر سے چھوٹے لگے۔ ماہرین کو پتہ چلا کہ رضا کاروں کی حیاتیاتی گھڑی کی رفتار یعنی عمر بڑھنے کا تعلق زیادہ تر ان کے طرز زندگی اور گرد و پیش کے ماحول سے تھا۔ تحقیق میں ایسی 18 چیزوں کی نشاندہی کی گئی ہے جو انسان کی عمر بڑھنے کی رفتار پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ ان میں اعضائے رئیسہ کی کارکردگی، خون کا دباؤ، کولیسٹرول اور شوگر کی سطح سمیت نیند کا دورانیہ، ورزش، ذہنی دباؤ، کام کرنے کی جگہ اور گھر کا ماحول نیز تمباکو اور الکوحل کے استعمال کی مقدار شامل ہے۔ تحقیق میں بتایا گیا ہے کہ انسانی ڈی این اے کی ساخت اس کے telomere کی لمبائی بھی عمر بڑھنے کی رفتار اور زندگی کی طوالت پر اثر انداز ہوتی ہے۔ لیکن اس عمل میں اس کا حصہ محض بیس فیصد کے لگ بھگ ہے، جبکہ دیگر اسی فیصد کا تعلق ہماری صحت، عادات اور گرد و پیش کے ماحول سے ہے۔

یہ ریسرچ کئی اہم پہلوؤں کو سامنے لاتی ہے اور درست بات یہی ہے کہ ہمیں اپنے لائف

سٹائل میں ایسی تبدیلیاں لانی چاہئیں جو ایک طرف بائیولوجیکل عمر کو ٹھیرا دے اور اس کے ساتھ اچھی صحت کی وجہ سے کوالٹی آف لائف بھی مل سکے۔ ایک پہلو اور بڑا اہم ہے کہ انسان کی فکری عمر کیا ہے، اس میں کس قدر اضافہ ہوتا ہے، کون کون سے فیکٹرز ایسے ہیں جو اسے اپنے ہم عصروں سے زیادہ میچور اور ذہنی طور پر برتر بنا دیں۔ پچیس سال کے دونو جوان یا چالیس سال کے پختہ عمر مرد جسمانی صحت میں یکساں ہو سکتے ہیں۔ اپنے جسم کا خیال کر کے، اچھی خوراک، ورزش کے ذریعے وہ ایک جیسے نظر آ سکتے ہیں، مگر کیا ان کی ذہنی عمر بھی یکساں ہے؟ ضروری نہیں کہ ایسا ہو۔ کئی احباب یہ بتاتے ہیں کہ برسوں بعد انہیں اپنے آبائی گاؤں، قصبہ یا شہر جانے کا اتفاق ہوا، اپنے ہم عمر کلاس فیلوز سے ملاقات ہوئی تو حیرت ہوئی کہ وہ ابھی تک دس پندرہ سال پرانی ذہنی، فکری عمر میں ہیں، لگتا ہے جیسے ان کے دماغ منجمد ہو گئے ہوں، گزرتے وقت نے کوئی تبدیلی نہیں پیدا کی۔

اس پر ممکن ہے سائنس دانوں نے ریسرچ کی ہو اور باقاعدہ منضبط نتائج اخذ کئے ہوں، مگر موٹی موٹی باتیں یہ سمجھ میں آتی ہیں کہ مسلسل مطالعہ، مشاہدہ، ایکسپوژر اور غور وفکر سے انسان اپنے ذہن کو بدل سکتا ہے۔ اوسط ذہنی صلاحیت سے وہ ذہین اور ذہین ترین لوگوں میں شامل ہو سکتا ہے۔ مطالعہ اس کے علم میں اضافہ کرتا اور تناظر وسیع کر دیتا ہے۔ مشاہدہ اسے بہت سی نئی باتوں اور جہتوں سے متعارف کراتا ہے، ایکسپوژر خاص کر بیرونی ممالک کے سفر اس کا ذہنی کینوس بڑا کر دیتے ہیں، نئے جہانوں سے وہ روشناس ہوتا ہے۔ سب سے بڑھ کر غور وفکر ہے۔ زندگی کی بنیادی حقیقتوں پر غور کرنا، ان کی حکمت کو جاننے، سمجھنے کی سعی۔ اس مقصد کے لئے اہل علم سے ملاقات، استفادہ از حد ضروری ہے۔ زندگی واقعی صرف عدد کا نام نہیں۔ یہ آپ کے اپنے اوپر ہے کہ آپ اسے کیسے بسر کرتے ہیں؟ جسمانی عمر اور ذہنی عمر دونوں کے لیے الگ الگ انداز میں سہی، مگر بہرحال ایک نظم وضبط کے ساتھ کوشش کرنا پڑتی ہے۔ اب جو جتنا گڑ ڈالے گا، اسے ثمر بھی اتنا ہی میٹھا ملے گا۔

طاہر محمود

پاکستانی عوام کا اصل چہرہ

رات گیارہ بجے کے لگ بھگ بائیک اور ڈیمپر آمنے سامنے ٹکرا گئے۔ بائیک والا شدید زخمی ہو گیا۔ لوگوں نے فوراً اٹھایا اور ہسپتال لے گئے۔ بندے کی جان بچ گئی۔ ڈاکٹرز نے بتایا کہ اگر مریض کو لانے میں مزید کچھ دیر ہو جاتی اور خون مزید نکل جاتا تو مریض نہ بچ پاتا۔ یہ لورہ چوک ہری پور کا واقعہ ہے۔ دو بائیکس آمنے سامنے ٹکرا گئیں اور چار بندے شدید زخمی ہو گئے۔ لوگ انہیں فوراً اٹھا کر ہسپتال لے گئے۔ ان پر پاس سے خرچہ بھی کیا اور خون کی ضرورت پڑی تو خون بھی دیا۔ چاروں کی جان بچ گئی۔

بندہ حادثے میں شدید زخمی ہو گیا۔ لوگ اٹھا کر ہسپتال لے گئے مگر انہوں نے دیکھنے سے انکار کر دیا۔ وہ لوگ اسے دوسرے شہر ایبٹ آباد لے گئے۔ پاس سے اچھا بھلا خرچہ بھی کیا، کافی سارا وقت بھی دیا اور اپنا خون تک دیا۔ حالانکہ ان میں سے کوئی بھی زخمی کو نہیں جانتا تھا۔

آخری رمضان کی بات ہے۔ گلگت سے اسلام آباد جاتی ہوئی کار کا سرائے صالح ہری پور میں حادثہ ہو گیا۔ گاڑی بالکل ٹوٹ گئی مگر اللہ نے سواریوں کو بچا لیا۔ مقامی سات آٹھ افراد اس وقت تک ان کی مدد میں لگے رہے، جب تک ان کے سارے معاملات حل نہیں ہو گئے۔

میرے ایک جاننے والے کا اپنی غلطی سے حادثہ ہو گیا۔ دو دن بعد ہوش آیا۔ ڈاکٹروں نے بتایا کہ آپ کو کچھ لوگ بروقت ہسپتال لے آئے تھے اور آپ کے علاج کے لیے بیس ہزار روپے بھی دے گئے۔ میرے جاننے والے کی بعد میں اپنے ان محسنوں سے کبھی بھی ملاقات تک نہیں ہوئی۔

بائیک گاڑی سے ٹکرا گئی۔ گاڑی والے کی کوئی غلطی بھی نہیں تھی۔ مگر اس نے اپنی قیمتی گاڑی

ادھر ہی چھوڑی اور بائیک والے کو دوسری گاڑی میں ڈال کر ہسپتال لے گیا۔ زخمی بہت سیریس تھا مگر بروقت طبی امداد ملنے سے اس کی جان بچ گئی۔ اسے تقریباً دس دن بعد ہوش آیا۔ اس دوران گاڑی والے بندے مسلسل اس کے ساتھ رہے اور اس کا لاکھوں روپے کا خرچہ بھی برداشت کیا۔ حالانکہ ان بے چاروں کی کسی قسم کی کوئی غلطی نہیں تھی۔ اور نہ ہی کسی نے انہیں ایسا کرنے پر مجبور کیا تھا۔ انہوں نے یہ سب محض انسانی ہمدردی سے کیا۔

یقین مانیں کہ یہ ان ہزاروں میں سے صرف چند واقعات ہیں جن سے میں خود ذاتی طور پر واقف ہوں۔ ایسے سینکڑوں واقعات پاکستان میں روزانہ رونما ہوتے ہیں مگر ان کو کبھی بھی نمایاں نہیں کیا جاتا۔ ان کی کوئی کوریج بھی نہیں ہوتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم اور ہمارا میڈیا صرف منفی چیزوں کو دیکھنے، سننے اور بولنے کے اتنے عادی ہو چکے ہیں کہ ہمیں مثبت میں بھی منفی نظر آنے لگتا ہے۔

ہمارے میڈیا نے پاکستان کی عوام کو صرف منفی پہلو دکھا دکھا کر لوگوں کے دل و دماغ میں منفیت بھر دی ہے۔ لہٰذا ہم ہر چیز کو اسی منفیت کی عینک سے دیکھتے ہیں اور دنیا بھی یہی سمجھتی ہے کہ یہ ہر خوبی سے محروم قوم ہے۔ حالانکہ جتنا دوسروں کی مدد کا جذبہ اس قوم میں ہے شاید ہی کسی دوسری قوم میں ہو۔ بس انہیں شعور دلانے، حوصلہ افزائی کرنے اور صحیح رخ پر چلانے کی ضرورت ہے۔

مجھے معلوم ہے کہ بعض اوقات اس کے برعکس واقعات بھی وقوع پذیر ہوتے ہیں مگر میں ان کا ذکر نہیں کر رہا۔ کیونکہ ان کا دن رات اور ہر وقت ذکر کرنے کے لیے ہمارا میڈیا اور دیگر بہت سارے حضرات پہلے سے ہی موجود ہیں۔

سید اسرار احمد بخاری

مسلکی تعصب کی عینک اتار کر آؤ کچھ مثبت سوچیں

بریلوی، دیوبندی اور اہل حدیث مسالک میں آپس میں کچھ اختلافات ہیں۔ یہ اختلافات زیادہ بڑے نہیں، مگر ان کی بنیاد پر برصغیر میں ایک طویل عرصے سے کفر، شرک اور اسی نوعیت کے سنگین فتوے ایک دوسرے کے خلاف دیے جاتے رہے ہیں۔

ان اختلافات کو دیکھنے کا ایک زاویہ وہ ہے جس میں مخالف فریق کی ہر بات کی غلط اور منفی توجیہ کر کے نفرت پیدا کی جاتی ہے۔ جبکہ ایک دوسرا زاویہ مثبت اندازِ فکر کا ہے جس میں حسن ظن سے کام لیا جاسکتا ہے۔ جس میں یہ سوچا جاسکتا ہے کہ ہمارا کام صرف سمجھانا ہے۔ ہمارا یہ کام نہیں کہ ہم لوگوں کے ایمان کا فیصلہ کریں یا اس دنیا میں ان کے خلاف نفرت پھیلائیں۔

ان تینوں مکاتب فکر کے پیروکار اگر اس طرز پر سوچنا شروع کر دیں تو یقیناً فاصلے سمٹ جائیں گے اور غیر ضروری اختلاف کا بھی خاتمہ ہو جائے گا۔ لیکن معاملہ چونکہ فرقے کا ہوتا ہے اور فرقہ پرستی اپنی حقیقت میں دینداری کے عنوان پر دکانداری چمکانے کا نام ہے، اس لیے بے جا طور پر ایک دوسرے کے رجحانات کو خوش اسلوبی سے قبول کرنے اور وسعت قلبی اپنانے کے بجائے لوگ ایک دوسرے کے رد میں کتابیں اور رسالے چھاپتے رہتے ہیں۔ اور بعض ظالم تو قرآن کی آیات اور احادیث نبوی کو بھی اپنے حق میں توڑ مروڑ کر پیش کرنے سے دریغ نہیں کرتے۔

مجھے اچھی طرح اندازہ ہے کہ احباب فروعی اختلاف کی شدت ثابت کرنے کے لیے ان تینوں مکاتب فکر کی کتابوں سے بہت کچھ خرافات جمع کر کے لا سکتے ہیں، لیکن اپنی حقیقت میں وہ سارا مواد دریا برد کر دینے کے قابل ہے۔ اتفاق رائے کے لیے امت کے پاس اتنا وسیع ذخیرہ

موجود ہے کہ اس قسم کا بے جا اختلاف سوائے انا پرستی کے اور کچھ نہیں۔

یہ محض ان تین ہی مکاتب فکر کی بات نہیں، چند ایک کو چھوڑ کر اور بہت سے مکاتب فکر کے ہاں بھی اختلاف کی نوعیت اکثر ایسی ہی ہے کہ اپنی بنیادوں میں جسے آپ رجحانات اور بعض صورتوں میں زاویہ نگاہ کا فرق کہہ سکتے ہیں۔ اور جہاں اختلافات کی وجوہات گہری ہیں تب بھی قرآن جیسی محفوظ کتاب جسے اللہ نے فرقان (حق و باطل میں فرق کرنے والی کتاب) کہا اور نبی علیہ السلام کی محفوظ سنت کی موجودگی میں رائے کا اختلاف کوئی بڑی اہمیت نہیں رکھتا۔ اور جو کچھ علمی اختلاف ہے بھی تو وہ ہر حال میں رہے گا اور قیامت تک رہے گا۔ لوگ جب تک سوچتے رہیں گے، مکاتب فکر بنتے رہیں گے۔ اگر یہ اختلاف ایک دوسرے کی تکفیر اور نفرت و شرانگیزی کی حدوں تک نہیں پہنچتا تو سوچنے والوں کو نئے نئے زاویئے عطا کرتا ہے۔

لہٰذا اتحاد اختلاف رائے کو ختم کرنے سے نہیں بلکہ اختلاف رائے کو گوارا کرنے سے پیدا ہوگا اور اس کی سب سے بڑی بنیاد تقویٰ اور خدا کے حضور جواب دہی کا سچا احساس ہے۔

اس کو ایک تمثیل سے یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ ایک جگہ کچھ لوگ بحث و جدال میں مصروف تھے۔ کسی نکتے پر اتفاق ہی نہیں ہو رہا تھا کہ اچانک وہاں سانپ نکل آیا۔ گھبرا کر سارے لوگ اس سانپ کو مارنے کے لیے متحد ہو گئے۔ حالت سکون میں جو لوگ کسی بھی نکتے پر متفق نہیں تھے حالت خوف میں سو فیصد متحد اور یک جان ہو گئے۔ یہی معاملہ آخرت کی جواب دہی کے خوف کا بھی ہے۔ اگر حقیقی معنوں میں اللہ کے حضور جواب دہی کا خوف امت کے تمام طبقات میں زندہ ہو جائے تو اتحاد کا قائم ہونا ویسا ہی یقینی ہو جائے جیسا سورج کے طلوع ہوتے ہی دن کا نکلنا یقینی ہوتا ہے۔

فداءالرحمٰن

ایگزیکٹوٹوکن

پچھلے دنوں اپنی چھوٹی بہنوں کے شناختی کارڈ بنوانے کے سلسلے میں نادرا دفتر جانے کا اتفاق ہوا۔لمبی لائن لگی ہوئی تھی ۔ جیسے تیسے ہمارا نمبر آیا اور ٹوکن ایشو کرنے والے تک رسائی مل گئی۔ نادرا اپنے صارفین کو ان کی استطاعت اور سروس کے مطابق مختلف پیکجز کے ٹوکن ایشو کرتا ہے۔ نارمل فیس کی ادائیگی کے بعد شناختی کارڈ کے حصول میں تقریباً ایک مہینہ لگ سکتا ہے۔اسی طرح ارجنٹ فیس میں کارڈ 15 سے 20 دن میں مل جاتا ہے۔لیکن ایک اور ٹوکن بھی ہے جسے ایگزیکٹوٹوکن کہا جاتا ہے۔اس میں ایک ہفتے کے اندر نہ صرف شناختی کارڈ موصول ہوجاتا ہے بلکہ کارڈ پروسیسنگ کے مرحلے سے لے کر کارڈ بننے اور قریبی نادرا رجسٹریشن سنٹر پہنچنے تک کی کارروائی سے لمحہ بہ لمحہ بذریعہ ایس ایم ایس باخبر بھی کیا جاتا ہے۔

ہم نے ایگزیکٹوٹوکن لیا اور اندر داخل ہوگئے۔ہمیں بالترتیب 46 اور 47 نمبر کے ٹوکن ایشو کیے گئے تھے۔جبکہ ڈیٹا انٹری سرور پر 12 نمبر کا ٹوکن چل رہا تھا۔یعنی ہم سے پہلے ابھی کافی صارفین کا ڈیٹا انٹر ہونے کے بعد ہماری باری تھی۔لیکن ایگزیکٹوٹوکن کی ترجیحی سہولت کی وجہ سے جیسے ہی ہمیں ٹوکن ایشو کیے گئے فوراً ہماری باری آ گئی۔اس پر ایک خاتون نے واویلا کرنا شروع کر دیا کہ وہ صبح سے انتظار کر رہی ہیں لیکن یہ لڑکیاں ابھی آئی ہیں اور فوراً ان کی باری آ گئی۔ڈیٹا انٹری آپریٹر نے خاتون کو تفصیلاً سمجھایا کہ ایسا کیوں ہوا۔معاملہ رفع دفع ہوا اور ہم تقریباً دس منٹ میں فارغ ہوئے۔

اس ایگزیکٹوٹوکن کی ایک اور سہولت یہ بھی ہے کہ پہلے کسی کلاس ون آفیسر سے نادرا رجسٹریشن فارم میں درج کوائف کی تصدیق کرنی پڑتی تھی لیکن اب کوئی بھی قریبی رشتہ دار مثلاً

والدین، بہن یا بھائی کوائف کی تصدیق اسی وقت بائیو میٹرک تصدیق کے ذریعے کر سکتا ہے۔تمام کارروائی مکمل ہونے میں تقریباً 10 منٹ لگے۔

میں باہر آنے کے بعد سوچنے لگا کہ آخرت میں بھی یہی ہوگا کہ جن کے جیسے اعمال ہوں گے ویسا ہی ٹوکن ملے گا اور اسی کے شایانِ شان سروس مہیا کی جائے گی۔ دنیا کی آزمائشوں میں سرخرو اور ابلیس کے ہتھکنڈوں سے اپنے نفس کو پاکیزہ رکھنے والوں کو یقیناً ایگزکٹو ٹوکن جاری کیا جائے گا جو اس بات کی نشانی ہوگی کہ یہ ایک سچا خدا پرست اور مومن بندہ ہے جو رب کی رضا کے حصول میں کامیاب و کامران رہا۔ وہاں ایسا ماحول ہوگا کہ کوئی ایسے ترجیحی سلوک پر معترض نہیں ہو پائے گا کیونکہ ہر انسان کے سامنے اپنے اعمال اور کردار کا دفتر تمام تفصیلات سمیت پڑا ہوگا۔ وہ بھی کیا پُر کیف لمحات ہوں گے جب تمام عالمِ انسانیت کے سامنے ایک نیک بندے کے اعمال و کردار اور اس کی نجات کا پروانہ علی الاعلان جاری کیا جائے گا۔

نیز جب اتمامِ حجت کا مرحلہ آئے گا تو اس وقت پیغمبر امن صلی اللہ علیہ وسلم بھی گواہی دیں گے کہ یا اللہ یہ میرے سچے امتیوں میں سے ایک ہے۔جس نے آپ کے دین کی سربلندی کے لیے بہت کچھ داؤ پر لگایا لیکن آپ کے دین پر کوئی آنچ نہیں آنے دی اور جس طریقے پر میں نے آپ کا دین پہنچایا تھا صرف اسی کی پیروی کی اور دین کے نام پر لوگوں کے اپنے بنائے ہوئے طوق پہننے سے انکار کیا۔ اس نے ہر قسم کے تعصب، بغض اور گروہی و مسلکی وابستگی سے بالاتر ہو کر صرف اسی بات کے سامنے سرِ تسلیم خم کیا جس کی تصدیق فرقانِ حمید نے کی۔ یا اللہ میں تیرے اس نیک بندے کے نیک اعمال اور کردار کی تصدیق کرتا ہوں!!!

وہ بھی کیا منظر ہوگا جب تمام انسانیت کے روبرو پیغمبرِ امن صلی اللہ علیہ وسلم اپنے کسی امتی کی اس انداز میں تصدیق کریں گے۔

فرح رضوان

والدین ہماری جنت بھی اور......

اولاد کی محبت والدین میں قدرتی طور پر موجود ہوتی ہے لیکن والدین سے محبت کرنا، ان کی عزت کرنے کا عمل ہمیں سیکھنا ہوتا ہے۔ ہم یہ سب وقت کے ساتھ ساتھ سیکھتے ہیں۔ ہم سے مراد اس مضمون میں صرف خواتین ہیں۔

کئی سال میں والدین کے مقام و عظمت کو جاننے کے بعد جب شادی ہوتی ہے اور دوسری جانب خدانخواستہ ناسمجھ شوہر یا سسرال سے واسطہ پڑ جائے تو خاتون کی والدین سے محبت کو ذرا اہمیت نہیں دی جاتی۔ اب ایسے حالات میں اس محبت و خدمت کے تقاضے نبھانے کی ذمہ داری مکمل طور پر آپ پر آن پڑتی ہے۔ آپ اس معاملے میں کچھ بھی کریں، بس اتنا ضرور یاد رکھیے گا کہ آپ کا ایک ایک انفرادی عمل آپ کے بچے دیکھیں گے اور کل کو یہ عمل اجتماعی اور معاشرتی رویے میں بدل جائے گا۔ آج کا بویا ہوا بیج کل کو تناور درخت بن جائے گا؛ پھلدار یا کانٹے دار، یہ آپ کے عمل پر منحصر ہے۔

شادی شدہ بیٹیوں کا والدین کی خدمت کرنا اور ان کو سکھی رکھنا ویسے تو شادی کی تیاریوں کے وقت ہی سے شروع ہو جاتا ہے جب والدین کو بے جا اخراجات سے روکنے یا ان کی جدائی کے احساس سے کہیں زیادہ موٹے موٹے آنسو، اپنے من پسند جہیز، جیولری، ہال، ڈریس اور نہ جانے کن کن ارمانوں کے دبانے اور کچل جانے پر بہہ نکلتے ہیں۔ بچپن میں ہم نہیں چاہتے کہ والدین کسی دوسرے بچے کے رزلٹ یا اچھی عادات سے ہمارا تقابل کریں۔ لیکن ہم اپنی شادیوں کے موقع پر بھی اور مزید کئی کئی سال بعد تک اس سلسلے میں دوسروں کے والدین سے ان کا تقابل جاری رکھتے ہیں، چاہے اس کا اظہار ہم کھل عام کریں یا دل میں دبائے رکھیں۔

اس کے بعد سسرال میں عزت پانے، میکے کی ساکھ بنانے، اپنی ٹور بٹھانے کی یا کم ازکم ایک بہتر پشت پناہی کا احساس دلانے کی باری آتی ہے۔ ان سب کا بھرم قائم رکھتے ہوئے سفید پوش یا غریب والدین کی جان و مال اور عزت پر بن آتی ہے۔ آخر ہم میں اس سلسلے کو ختم کرنے والا کوئی ٹرینڈ سیٹر پیدا کیوں نہیں ہوتا؟

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ عزت، رزق، محبت سب وہی عطا فرماتے ہیں، جبکہ خواتین کے ایسے رویے کو دیکھ کر لگتا ہے کہ ان کی ساکھ کا برتن والدین کی راکھ سے ہی چمکنا ممکن ہے۔

خدارا اپنے اور اپنے والدین کا احساس کرتے ہوئے دو کام ضرور کریں، پہلا یہ کہ کسی بھی امیر، یا سطحی سوچ والی دوست یا رشتہ دار خاتون سے متاثر نہ ہوں، نہ ہی اس تاثر سے اپنے والدین کو متاثر کریں۔ دوسرا یہ کہ دل پر جبر کر کے کچھ ایسے اصول مرتب کریں جن سے آپ کے لگائے اس درخت کی چھاؤں میں آپ کے والدین اور آنے والی نسلیں آرام کریں۔ اس بات کی گہرائی کو سمجھیں کہ نیت میں خلوص ہو تو اللہ کی مدد شامل حال رہتی ہے۔ اگر آپ کے سسرالی رشتے دار آپ کی اچھائی کے باوجود اپنا طرز عمل نہیں بدلتے اور ہنوز طعنہ زنی، غصہ یا جاہلیت کا مظاہرہ کرتے ہیں تو آپ اپنے بچوں کی تربیت ایسے کریں کہ کل کو اچھے عمل کرنے اور اس کو آگے پھیلانے کے لیے ایک نسل تیار ہو۔

اگر یہ دور گزر چکا تب بھی اس پر دکھی رہنے کے بجائے اب والدین کی طرف سے صدقہ کیا جاسکتا ہے۔ آپ مالی استطاعت نہیں رکھتے نہ سہی، نیک اولاد صدقہ جاریہ ہے، آپ خود نیک عمل کریں اور اپنی اگلی نسل کی تربیت بہترین طرز پر کریں۔ سب سے بڑا تحفہ والدین کے لیے ہوتا ہی یہ ہے کہ اولاد ان کے لیے صدقہ جاریہ بن جائے۔ اگر وہ حیات ہیں تو اپنی ہر کامیابی پر ان کو احساس دلانا کہ ہاتھ پکڑ کر چلنے سے لے کر، لکھنا، پڑھنا انہوں نے ہی اپنے عمل یا قربانی

سے سکھایا ہے۔

سب سے بڑی بات یہ کہ آپ اپنے گھروں میں سکھی رہیں، یہی سب سے بڑی خدمت ہے۔ بات بات پر ان کے سامنے رونا، میکے چلے آنا، قطعی والدین کی خدمت کرنا نہیں، الٹا ان کو دکھی کرنا ہے۔اسی طرح اگر وہ اپنے گھر میں بہو، بیٹے یا کسی دوسرے کے ناروا سلوک پر دل برداشتہ ہیں تو ان کی حتی الامکان دلجوئی کریں۔کبھی ان کے ساتھ مل کر ہر کس و ناکس کی غیبت والا رویہ نہ اپنائیں بلکہ کوشش کریں کہ اگر وہ کسی سے خفا ہیں تو صلح کروادیں۔

ٹی وی لے دینا، ''سبق آموز'' ڈراموں کی طرف ''رہنمائی'' کرنا بھی والدین کی خدمت نہیں۔دل کا سکون اللہ کے ذکر میں ہے تو اپنے رب کی حمد کے ساتھ اُس کی تسبیح کرواور اُس سے مغفرت کی دعا مانگو، بے شک وہ بڑا توبہ قبول کرنے والا ہے۔(النصر)

ان کے لیے مثبت دلچسپیاں اور مصروفیات فراہم کریں۔لیکن یہاں مصروفیت کے نام پر اپنے بچوں کی مکمل دیکھ بھال میں ان کو الجھائے نہ رکھیں۔ بڑھتی عمر میں والدین کو اپنے بچوں کے شور ہنگامے سے محفوظ رکھنا بھی والدین کی خدمت ہے۔والدین کی بیماری میں ان کی ہر ممکن مدد ضرور کریں لیکن اگر دوسرے بہن بھائی موجود ہیں تو پھر بات مختلف ہوگی ،اب صرف آپ ہی واحد مددگار نہیں۔دوسرا یہ کہ اگر والدین کسی بھائی کے گھر پر ہیں تو وہاں جا کر ثابت کرنا کہ بھاوج تو انسانی حقوق کی پاسداری تک بھی نہیں کر رہی تھی، یہ درست نہیں۔نیکی برباد گناہ لازم غالباً کچھ اسی قسم کی صورتحال کو کہتے ہیں۔اس سے بچنا چاہیے۔

اور آخری بات ان کے لیے جن کو آزمائش کے طور پر اچھے والدین نہیں ملے ،وہ ان کو معاف کردیں، جو خود اچھے بچے نہیں بن سکے، وہ خود کو بھی معاف کردیں اور اللہ تعالیٰ سے بھی معافی مانگتے رہیں،صدقہ کرتے رہیں کہ اس کے سوا زندگی میں خوش رہنے کا کوئی تصور نہیں۔

عثمان حیدر

ایک مغالطہ......

میرا اللہ مجھ سے پیار نہیں کرتا، اسی لیے میری کوئی دعا قبول نہیں کرتا، اسے میری پروا نہیں، ایک قریبی عزیز نے کہا تو دل بھر آیا اور عرض کی:

دل کو آپ کا یہ جملہ گہرا گھاؤ لگا گیا کہ وہ مجھ سے پیار نہیں کرتا...... وہ مجھے پسند نہیں کرتا...... کیا پسند کیے بغیر آپ کو انسان بنا دیا...... آپ کو عقل و شعور سے نوازا...... اسلام جیسی بڑی دولت بغیر مانگے دے دی پھر صحیح عقائد کی پہچان اور ان پر مضبوط یقین نصیب فرمایا......

بدلے میں ہم نے کیا دیا اس رب کو...... نافرمانیاں...... بغاوتیں...... شکوے...... شکایتیں...... کیا اس نے بھی کبھی کوئی شکوہ کیا ہے...... کہ ظالمو میرا ہی کھاتے ہو، میرا ہی پیتے ہو، میری مہربانیوں کے سائبان تلے رہتے ہو پھر میرا شکر گزار بننے کی بجائے میرے فیصلوں کو روندتے ہو......

کیا کبھی اس نے یہ کہہ کر ہاتھ سے نوالا چھینا، جسم سے لباس اتروایا، پانی کی نعمت سے محروم کیا کہ جاؤ تم اس قابل ہی کہاں جو یہ نعمتیں تمھیں دی جائیں...... یا وہ ایسا کرنے پر قادر نہیں...... کیا ہمارے گناہ ایسے ہی نہیں ہیں کہ ہمارے ساتھ یہ سلوک کیا جائے...... پر نہیں، وہ ایسا نہیں کرتا کیونکہ وہ ماؤں سے بڑھ کر پیار کرتا ہے۔

وہ سارے حال سے واقف ہے لیکن ہماری خواہش کے مطابق فیصلوں میں تاخیر ہمارے گناہوں اور اس کی حکمت کے تحت ہے بخدا اسی میں ہماری بہتری ہے، ہمیں سمجھ اس لیے نہیں آتا کہ اس کی بڑی حکمتیں ہماری چھوٹی سی عقل میں سما نہیں سکتیں۔

خدارا اس شیطانی خیال کو کھرچ ڈالیے دل و دماغ سے اور یہ خود سے تنہائیوں میں پوچھیے کہ

اگر وہ ہی مجھ سے پیار نہیں کرتا تو کون ہے جو میرا ہے...... کون ہے جو دل کے نہاں خانوں میں پلنے والی خواہشات کا بھی احترام کرتا ہے......اور خود کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر کہیے کہ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے، میرے آنسوؤں کا قدر دان ہے۔اور میری ساری خواہشات اور آرزوئیں اسی کے در سے پوری ہوں گی اور بالضرور ہوں گی کہ وہی میرا سب سے بڑا خیر خواہ ہے...... اور پوری دلجمعی اور اس یقین کے ساتھ تنہائیوں میں دعا کے لیے ہاتھ اٹھائیے کہ وہ میری آہ وفغاں سن رہا ہے اور اسے میرا احساس ہے اور وہ دعائیں قبول کر رہا ہے......اور بس مانگتے جائیے کہ اسی کے در سے حاجت روائی ہوتی ہے اور کھٹکھٹاتے جائیے اسی کے در کو کبھی تو کھلے گا اور اس کی محبت باہوں میں لے لے گی...... ان شاءاللہ......

سحر شاہ

تکرار

سائیکالوجی کے مطابق توجہ کے بیرونی عوامل میں سے ایک تکرار ہے۔ کسی بھی عمل یا بات کو بار بار دہرانا ہی تکرار کہلاتا ہے اور ہماری توجہ فوراً ایسی چیزوں پر مرکوز ہو جاتی ہے جن کی تکرار ہمارے سامنے کی جائے۔ کوئی بھی ایڈورٹائزنگ ایجنسی اس کا بھرپور فائدہ اٹھاتی ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھیے کہ خریداری کرتے وقت اگر آپ سے پوچھا جائے کہ آپ کو کس کمپنی کی پروڈکٹ چاہیے تو آپ ہمیشہ اس کمپنی کا نام بتائیں گے جو دن رات وقفے وقفے سے ٹی وی پہ اپنے اشتہارات نشر کرواتی رہتی ہے۔ ٹوتھ پیسٹ کا پوچھا جائے تو آپ کے ذہن میں فوراً کولگیٹ کا نام ابھرے گا، سرف کے لیے ایکسل یا بونس، شیمپوز میں Pantene یا Dove، اسی طرح دیگر اشیاء کے معاملے میں بھی ان سے متعلق کچھ مخصوص کمپنیز کے نام یاد آ جاتے ہیں۔ یہ سب تکرار کا نتیجہ ہے۔ جو چیز یا نام آپ کو دن رات ٹی وی، انٹرنیٹ، اخبارات، سائن یا بل بورڈز و دیگر ذرائع سے غیر محسوس طور پر ذہن نشین کرا دیا جائے، آپ اپنی پوری زندگی اس نام کو قابل اعتماد سمجھتے ہیں چاہے معاملہ اونچی دکان پھیکا پکوان والا ہی کیوں نہ ثابت ہو۔ اس طرح تکراری عمل کا فائدہ اٹھا کر صارفین کو اپنی پراڈکٹس فروخت کی جاتی ہیں۔

تکرار سے متاثر ہونے کا دائرہ کار بہت وسیع ہے۔ نہ صرف مارکیٹنگ کی دنیا میں یہ موثر ثابت ہوتی ہے بلکہ انسانی شخصیت کی تعمیر میں بھی اس کا مرکزی کردار ہے۔ اگر ایک بچہ اپنے اردگرد بڑوں کو بلند آواز سے بات کرتے دیکھتا ہے تو لاشعوری طور پر وہ بھی بلند لہجہ اپناتا ہے۔ اگر آپ کوئی بھی عمل بچے کے سامنے بار بار کرتے ہیں تو بچہ لازماً وہ کام کرتا ہے۔ مثال کے طور پر معصوم بچے ہمیشہ سچ بولتے ہیں، لیکن اگر گھر کا کوئی فرد ان کے سامنے جھوٹ بولتا ہے تو بچے کا

ذہن متاثر ہوتا ہے۔ وہ یہ سیکھتا ہے کہ کسی بھی چھوٹے یا بڑے مفاد کی خاطر کس طرح غلط بیانی سے کام لینا ہے یا سچ کو کس طرح چھپانا ہے۔ اسی طرح گھر میں یا اردگرد کے ماحول میں گالی گلوچ، بدتہذیب رویے، ناانصافی، بخل، ظلم وزیادتی یا عزت نفس کو مجروح کرنا غرض کسی بھی برے عمل کی تکرار بچے کی شخصیت پر منفی اثر ڈال سکتی ہے۔ جبکہ سلجھا ہوا صحت مند ماحول بچے کو مثبت انداز میں متاثر کرتا ہے۔ یعنی آپ کی بار بار کی گئی بات یا عمل ایک شخصیت کو بنانے یا بگاڑنے کا باعث بنتا ہے۔ اس لیے نہ صرف ماں باپ بلکہ گھر کے دیگر افراد کو بھی اس سلسلے میں احتیاط سے کام لینا چاہیے اور تکراری عمل کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ہمیشہ بچے کو اچھی باتیں اور بہترین اعمال سکھانے چاہئیں۔

بچپن سے لے کر باقی ساری زندگی تک تکرار کی مقناطیسی فیلڈ سے متاثر ہونے کا عمل جاری رہتا ہے۔ دور جدید میں ذرائع ابلاغ میں تکرار کا استعمال کرتے ہوئے انسانی رائے عامہ کو کسی خاص رخ پر متعین کیا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ میڈیا میں اکثر منفی چیزوں کو موضوع بحث بنایا جاتا ہے۔ کسی بھی خبر کا منفی پہلو جب عوام کے سامنے مسلسل پیش کیا جاتا رہے تو نتیجتاً پوری قوم کی نفسیات میں منفی نقطہ نظر کو قبول کرنے کا رجحان بھی بہت زیادہ بڑھ جاتا ہے۔ منفی چیزوں کی تکرار سے آپ کا مائنڈ سیٹ منفی ہو کر رہ جاتا ہے جس سے پھر دوسری خرابیاں جیسے بحث برائے بحث، محدود ذہنیت اور تعصب جیسی صورتیں میڈیا پر ہی سب کے سامنے آتی ہیں۔

اس سے پاکستان کا امیج نہ صرف ملک میں بلکہ بین الاقوامی سطح پر بھی ایک ناکام ریاست کے طور پر قائم ہوتا ہے...... ایک ایسی ریاست جہاں حکومت خود غرض اور عوام مسلکی و سیاسی جھگڑوں میں مصروف عمل نظر آتی ہے۔ اور اس سب المیہ کی وجہ وہی ہماری قوم کا منفی طرز فکر سے کام لینا ہے جو کہ ذرائع ابلاغ کا ہی مرہون منت ہے۔ نہ صرف عام ذہنی سطح کے حامل لوگ بلکہ

خود کو بہت عاقل و بالغ سمجھنے والے لوگ بھی میڈیا کے تکراری عمل سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

ایسے حالات میں ضرورت اس امر کی ہے کہ منفی تکرار کے بجائے مثبت تکرار سے متاثر ہوا جائے۔ میڈیا کے انڈیلے ہوئے نفرت انگیز اور منفی پہلوؤں کو نظر انداز کر کے مثبت ذرائع سے تعلق جوڑا جائے۔ اور یہ مثبت طرز فکر آپ کو آپ کا اپنا رب عطا فرماتا ہے جو دن میں پانچ بار آپ کو ہر قسم کی منفی سوچ سے پاک ہونے کی دعوت دیتا ہے۔ جو آپ کے ساتھ ہمکلام ہونے کے لیے اپنا در ہمیشہ کھلا رکھتا ہے۔ جس نے قرآن جیسی ہدایت والی کتاب نازل کی جو ہر منفی صورتحال میں بھی مثبت رہنے کی تلقین کرتی ہے۔ مگر اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم قرآن کو سمجھ کر پڑھنا سیکھیں۔ دن میں پانچ بار فرض کی گئی نماز کی ادائیگی کا عمل بھی تکرار ہی ہے لیکن یہ مثبت اثرات مرتب کرنے والی تکرار ہے۔ آپ اپنے ماحول کے منفی اثرات سے محفوظ رہ سکتے ہیں اگر رب سے تعلق مضبوط رکھیں۔ نماز و قرآن کے ذریعے مثبت کی تکرار آپ کو ایک مثبت طرز فکر رکھنے والے شخص میں ڈھال دے گی۔

مبشر نذیر

ترکی کا سفرنامہ (51)

ڈاکٹر شعبان علی ڈوزگون سے ملاقات

اوپر پہنچے تو ایک صاحب ہمارے منتظر تھے جو اپنے رکھ رکھاؤ سے ہی اعلیٰ درجے کے اسکالر نظر آرہے تھے۔ انہوں نے ہمارا پرتپاک استقبال کیا۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ ہم پاکستان سے آئے ہیں تو ان کی گرمجوشی میں کئی گنا اضافہ ہوگیا۔ تعارف سے معلوم ہوا کہ ان کا نام ڈاکٹر شعبان علی ڈوزگون ہے۔ انہوں نے واشنگٹن کی جارج ٹاؤن یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کی ہوئی تھی۔ یہ وہی یونیورسٹی ہے جہاں مشہور مستشرق جان ایل ایسپوزیٹو جیسے اسکالر فیکلٹی کا حصہ ہیں۔

عام مستشرقین کے برعکس ایسپوزیٹو غیر متعصب اور کھلے ذہن کے مالک ہیں۔ انھوں نے ''مسلم کرسچن انڈراسٹینڈنگ'' کے نام سے ایک ادارہ بنایا ہوا ہے جو اہل مغرب کو اسلام کی صحیح تصویر پیش کرنے کے لئے کوشاں ہے۔ یہ ادارہ پرانے مستشرقین کی طرح متعصّبانہ طریقہ اختیار کرنے کے بجائے کھلے ذہن سے اسلام کو سمجھنے اور سمجھانے میں مصروف ہے۔ ان کی کوشش ہے کہ مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان احترام اور انسانیت کے تعلقات قائم کیے جائیں۔ اس ادارے کی ویب سائٹ کا ایڈریس ہے:

www.cmcu.georgetown.edu

ڈاکٹر شعبان ہمیں لے کر اپنے دفتر میں آ گئے۔ یہ ایک لمبوترا سا خاصا بڑا کمرہ تھا جس کی دو دیواروں کے ساتھ صرف کتابوں کے ریک لگے ہوئے تھے۔ کتابوں میں ناصر الدین البانی کی "ارواء الغلیل" اور ابن تیمیہ کا "مجموعہ الفتاوی" نمایاں تھے۔ ایک جانب الہ دین کے چراغ کی طرز کا ایک چراغ پڑا ہوا تھا۔ ایک کونے میں کھانے پینے کا سامان رکھا ہوا تھا جس میں الیکٹرک

کیتلی، چائے، بسکٹ اوراس قبیل کی چیزیں شامل تھیں۔ دوسرے کونے میں ایک ستار بھی رکھی ہوئی تھی۔

ڈاکٹر صاحب سے تفصیلی ملاقات ہوئی جس میں بہت سے مذہبی موضوع زیر بحث آئے۔ میں نے خاص طور پران سے ترکی اوراسلام کے حوالے سے بات چیت کی۔ڈاکٹر صاحب نے خاص طور پر غیر مسلموں کواسلام سے متعارف کروانے کے لئے انگریزی زبان میں ایک کتاب لکھی ہے جس کا عنوان ہے Uncovering Islam ۔اس کتاب میں انہوں نے دین کے بنیادی تصورات، اعمال اور تاریخ کو بیان کیا ہے۔ انہوں نے اس کتاب میں اسلام اور انسانیت کے تعلق کو بیان کیا ہے۔

ترکی کی مذہبی زندگی کے بارے میں ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ اگرچہ ترکی کی حکومت نے سختی سے سیکولرازم کی پالیسی اختیار کی ہوئی ہے مگراس کے باوجود حکومت نے مصطفیٰ کمال کے زمانے سے ہی ''دیانت'' کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا ہوا ہے۔ یہ ادارہ نہ صرف ترکی بلکہ یورپ کے مختلف مما لک بالخصوص جرمنی میں موجود مساجد کا انتظام کرتا ہے۔ ملک بھر میں یونیورسٹیوں کے الٰہیات ڈیپارٹمنٹ کا تعلق دیانت سے ہے۔ بیرون ملک مقیم ترک عام طور پر زیادہ دین دار ہیں۔ یہ ان یونیوسٹیوں میں آ کر دین کی تعلیم حاصل کرتے ہیں اور پھر واپس یورپی مما لک میں جا کر دعوتی وتبلیغی کام سرانجام دیتے ہیں۔ جرمنی میں اسلام کا تعارف انہی لوگوں کے ذریعے پہنچ رہا ہے۔

ترکی کی موجودہ حکومت کے بارے میں انہوں نے بتایا کہ جسٹس اینڈ ڈیویلپمنٹ پارٹی کی لیڈرشپ دینی اعتبار سے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے۔ترکی کا مسئلہ بھی بڑی حد تک پاکستان سے مشابہ ہے کہ وہاں فوج سیاست میں مداخلت کرتی رہتی ہے۔لیکن اب حالات بدل رہے ہیں اور فوج

کی مداخلت ملکی معاملات میں کم ہو رہی ہے۔ اس کے نتیجے میں حکومت نے بڑی حد تک سیکولر فاشسٹ پالیسیوں کو ختم کرنے کی کوشش کی ہے۔ اب یونیورسٹیوں کے دروازے ان خواتین کے لئے کھل گئے ہیں جو کہ دین پر عمل کرتے ہوئے حجاب لینا چاہتی ہیں۔

ترکی کی دینی تحریکوں اور مکاتب فکر کے بارے میں انہوں نے بتایا کہ یہاں غالب اکثریت حنفی ماتریدی مسلک سے تعلق رکھتی ہے۔ یہاں کی دینی تحریکیں بہت مضبوط اور متحرک ہیں۔ جب سیکولر فاشسٹوں کی طرف سے انہیں پابندیوں کا سامنا ہوتا ہے تو یہ تحریکیں انڈر گراؤنڈ ہو جاتی ہیں۔ جب مذہبی آزادی کا دور آتا ہے تو یہ لوگ دوبارہ متحرک ہو جاتے ہیں۔ تصوف کے میدان میں غالب اکثریت نقشبندی سلسلے سے تعلق رکھتی ہے اگرچہ قادری سلسلہ بھی یہاں موجود ہے۔ نقشبندی حضرات کاروبار اور بینکنگ کے میدان میں چھائے ہوئے ہیں اور ملک کی معیشت پر ان کا کنٹرول غالب ہے لیکن یہ حضرات موجودہ نظام میں رہتے ہوئے کام کرتے ہیں۔

میں نے ان سے پوچھا: ''ترکی میں جو وقت گزارا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اخلاقی اعتبار سے ترک بہت اچھے ہیں، اس کی کیا وجہ ہے؟'' کہنے لگے، ''یہ بات میرے لئے فخر کا باعث ہے کہ آپ کی یہ رائے ہے۔ یہ بات درست بھی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں خاندانی اور کمیونٹی کا نظام بہت مضبوط ہے۔ اس نظام کے تحت ہر شخص میں مضبوط اخلاقی اقدار راسخ کر دی جاتی ہیں۔'' ان کی یہ بات ہمارے لئے خوشی کا باعث تھی کہ مغرب زدگی کو اس حد تک مسلط کر دینے کے باوجود ترکی میں خاندان کا ادارہ تباہ نہ ہو سکا ہے بلکہ اپنی پوری جڑوں کے ساتھ موجود ہے۔

ڈاکٹر شعبان کو اچانک خیال آیا کہ انہوں نے ہم سے کچھ کھانے کے لئے نہیں پوچھا۔ وہ فوراً

کھڑے ہو گئے اور بولے، ''آپ کیا لینا پسند کریں گے؟ میں آپ کو چائے اور بسکٹ پیش کر سکتا ہوں۔'' ہم نے ان کا شکریہ ادا کیا مگر انہوں نے اپنے اسٹاک سے بسکٹوں کا ایک ڈبہ برآمد کیا اور خاص طور پر اسے ماریہ کو پیش کر دیا۔

حدیث پراجیکٹ

کچھ عرصہ پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث سے متعلق انقرہ یونیورسٹی کے ایک پراجیکٹ کی خبر اخباروں میں آئی تھی۔ مغربی میڈیا نے اس پراجیکٹ کو Radical Reinterpretation of Islam کے عنوان سے تعبیر کیا تھا۔ میں خاص طور پر اس پراجیکٹ سے متعلق معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ ڈاکٹر شعبان کہنے لگے کہ یہ پراجیکٹ انقرہ یونیورسٹی کا نہیں ہے بلکہ دیانت کا ہے۔ اس کام کے لئے انہوں نے ملک بھر کی مختلف یونیورسٹیوں کے اسکالرز کی مدد حاصل کی ہے۔

مغربی میڈیا نے اپنے مقاصد کے لئے اس پراجیکٹ کو بدنام کر دیا ہے۔ اس ضمن میں پراجیکٹ کی ویب سائٹ www.hikem.net پر ایک تفصیلی پریس ریلیز شائع کی گئی ہے جس میں بڑے شد و مد سے اس بات کا انکار کیا گیا ہے کہ اس پراجیکٹ کا مقصد ہرگز ہرگز اسلام کی تشریح نو نہیں ہے۔ اس پراجیکٹ کا مقصد احادیث کے پورے ذخیرے کو جدید طرز زندگی سے متعلق ابواب میں تقسیم کر کے شائع کرنا ہے۔ اس پراجیکٹ میں محدثین کے طریقے پر احادیث کے ذخیرے کا درایت و روایت کے نقطہ نظر سے جائزہ لینا ہے۔ اس معاملے میں قدیم محدثین کے قائم کردہ اصولوں کی روشنی میں احادیث کے ذخیرے کا جائزہ لیا جا رہا ہے۔

قارئین کی دلچسپی کے لئے عرض کرتا چلوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کسی بات کو منسوب کرنے کا معاملہ بہت ہی نازک ہے۔ ایک حدیث کے مطابق جو شخص حضور سے کسی بات

کو غلط طور پر منسوب کرے، اس کا ٹھکانہ جہنم ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے قدیم اہل علم نے حدیث کے بارے میں بے پناہ احتیاط سے کام لیا ہے۔ کسی بات کے بارے میں یہ اطمینان کرنے کے لئے کہ اس کی نسبت واقعتاً حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے درست ہے یا نہیں، بنیادی طور پر دو طریقے اختیار کیے گئے ہیں۔ ان طریقوں کو ''روایت'' اور ''درایت'' کا نام دیا گیا ہے۔

روایت کے طریقوں کے مطابق یہ دیکھا جاتا ہے کہ حدیث روایت کرنے والے کون لوگ ہیں؟ کیا وہ قابل اعتماد ہیں یا نہیں؟ ان کی عمومی شہرت کیسی ہے؟ اگر کسی راوی کے بارے میں ذرا سا بھی شک پڑ جائے تو یہ حدیث ناقابل قبول کے درجے میں آجاتی ہے۔ درایت کے طریقوں میں حدیث کے متن کا جائزہ لیا جاتا ہے کہ اس حدیث میں بیان کردہ بات قرآن مجید، دیگر صحیح احادیث اور عقل عام کے مطابق ہونی چاہیے۔ اگر اس میں کوئی تضاد پایا جائے تو اس حدیث کو ''شاذ'' قرار دے کر مسترد کر دیا جاتا ہے۔ حدیث کو مسترد کرنے کا معنی یہ نہیں کہ معاذ اللہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو رد کیا جائے۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس حدیث کی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف نسبت درست نہیں ہے یا آپ کی بات کو صحیح طور پر بیان نہیں کیا گیا ہے۔ اس فن کی تفصیل آپ میری کتاب علوم الحدیث: ایک مطالعہ میں دیکھ سکتے ہیں۔

کچھ دیر ان سے گفتگو کے بعد ہم باہر نکلے۔ میری اہلیہ اس گفتگو سے کافی بور ہو رہی تھیں۔ اس لئے وہ نیچے گاڑی میں جا کر بیٹھ گئیں جبکہ میں کسی اور اسکالر کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ ان دنوں چھٹیاں تھیں۔ اس وجہ سے زیادہ تر کمرے بند تھے۔ ایک کمرہ کھلا نظر آیا تو میں اس میں داخل ہو گیا۔

پروین سلطانہ حنا

غزل

جنھیں کمالِ ہنر میں زمانے لگتے ہیں
وہ اپنے عکس میں آئینہ خانے لگتے ہیں

کہ طاقِ جاں میں محبت کا زخم روشن ہے
ہوا چلے تو دیے جھلملانے لگتے ہیں

مسافتوں سے بدن ہیں، غبار آلودہ
خِصال ایسے کہ اُجلے زمانے لگتے ہیں

ابھی تو درد کا دریا کہیں رُکا بھی نہیں
یہ کون لوگ مجھے یاد آنے لگتے ہیں

عزیز جان کے رکھّوں جو غم نگاہوں میں
یہ میری آنکھ سے کاجل چُرانے لگتے ہیں

وہ بات ایک ہی لمحے میں کس طرح کہہ دی
وہ بات کہنے میں جس کو زمانے لگتے ہیں

محبتوں کی بھی سوغات لے نہیں سکتے
یہ کیسے لوگ ہیں مجھ کو دیوانے لگتے ہیں

بس ایک منظرِ پیہم سے تھک گئی آنکھیں
حنا فلک پہ ستارے پرانے لگتے ہیں

ابو یحییٰ کے ناول

جو آپ کی سوچ، زندگی اور عمل کا محور بدل دیں گے

جب زندگی شروع ہوگی

ایک تحریر جو ہدایت کی عالمی تحریک بن چکی ہے

قسم اس وقت کی

ایک منکرِ خدا لڑکی کی داستان سفر، جو سچ کی تلاش میں نکلی تھی

آخری جنگ

شیطان کے خلاف انسان کا اعلان جنگ

خدا بول رہا ہے

عظمتِ قرآن کا بیان ایک دلچسپ داستان کی شکل میں

پورا سیٹ منگوانے پر خصوصی رعایت

گھر بیٹھے کتب حاصل کرنے کے لیے ان نمبرز پر رابطہ کیجیے

0332-3051201 , 0345-8206011

Please visit this link to read the articles and books of Abu Yahya online for free.

www.inzaar.org

To get Abu Yahya Quotes Join us on twitter:

Twitter ID: @AbuYahya_inzaar

To read Abu Yahya articles regularly Join us on Facebook

Abu Yahya Page: www.facebook.com/abuyahya.inzaar

Abu Yahya Account: www.facebook.com/abuyahya.jzsh

Join us on Youtube

Search inzaar on YouTube to see our audios and lectures

To get monthly books, CDs/USB and Inzaar's monthly magazines at home anywhere in Paksitan, contact # 0332-3051201 or 0345-8206011

To participate in online courses, visit www.inzaar.org/online-courses/

To get any other information, email to globalinzaar1@gmail.com

Following material in audio form is available on USB/CD:

Quran Course by Abu Yahya

Quran Translation and Summary by Abu Yahya

Islahi Articles

Jab Zindagi Shuru Hogi (book)

Qasam Us Waqt Ki (book)

Aakhri Jang (book)

Monthly
INZAAR

FEB 2018
Vol. 06, No. 02
Regd. No. MC-1380

Publisher: Rehan Ahmed Printers: The Sami Sons Printers,
25-Ibrahim Mansion, Mill Street, Pakistan Chowk, Karachi